طلوعِ اسلام

فروری ۱۹۵۶ء

ادارہ طلوعِ اسلام لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ

(پاکستانی) بارہ آنے

(ہندوستانی) بارہ آنے

بدلِ اشتراک

سالانہ ... آٹھ روپے (پاکستانی) ہندوستانی سالانہ - آٹھ روپے

غیر ممالک سے سالانہ [illegible]

۲۰ شلنگ

جلد (۹) نمبر ۱ فروری سنہ ۵۶ء ۱۹

فہرستِ مضامین

لمعات	۳ — ۱۸
بقیہ لمعات	— ۸۲
ہندوستان میں مذہبِ اسلام پر نظرِ ثانی کی ضرورت	۱۹ — ۴۶
تربیتی مرکز	۴۷ — ۴۸
مجلسِ اقبال	۴۹ — ۵۳
یادِ اسلم	۵۴ — ۵۷
پانچ ہزار راتیں گذر گئیں	۵۸ — ۵۹
حقائق و عبر	۶۰ — ۶۳
صالحین کے کارنامے	۶۴ — ۶۸
اشتہارات	۶۹ — ۸۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(مسوّدۂ دستورِ پاکستان)

اے حسن! گر ازراست نرنجی، سخنے ہست

نازایں ہمہ یعنی چہ؟ کمر بیچ و دہاں ہیچ

بہت دنوں کے انتظار کے بعد، بالآخر دستورِ پاکستان کا ایک جدید مسودہ منظرِ عام پر آگیا جو اس وقت مجلس آئین ساز کے زیر بحث ہے یوں تو ہر مملکت کا دستور ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ دستور ہی وہ بنیاد ہوتی ہے جس پر اس مملکت کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے لیکن پاکستان کے معاملہ میں یہ اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب اہلِ امریکہ نے محترم لیاقت علی خاں (مرحوم) سے پوچھا کہ آئینِ پاکستان کی تسوید میں اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ اگر ہمارا معاملہ بھی دنیا کی عام مملکتوں جیسا ہوتا تو ہم اپنا آئین کبھی کا بنا چکے ہوتے۔ لیکن پاکستان کا معاملہ دنیا کی مملکتوں سے بالکل الگ ہے۔ ہم پاکستان کو اسلامی تصورات و نظریات حیات کی عملی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں جس کے نتائج دنیا پر اس حقیقت کو منکشف کر دیں گے کہ اسلام کی تعلیم کس طرح بے مثل و بے نظیر ہے اس لئے پاکستان کا دستور بھی ایسا ہوگا جس کی مثال آپ کو کہیں نہ مل سکے گی۔ یہ وجہ ہے کہ ہمارے آئین کی تسوید میں اس قدر تاخیر ہو رہی ہے۔ جب اس قسم کے دعاوی کے پس منظر میں اس مسودہ کو دیکھا جائے تو بیحد افسوس ہوتا ہے۔ اس سے پہلے، دنیا مسلمانوں کی حالت سے اسلام کی تعلیم کا اندازہ لگایا کرتی تھی اور کہا کرتی تھی کہ اگر اسلام نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا تو اس کی حامل قوم کی یہ حالت کیوں ہوتی؟ اب دنیا یہ کہے گی کہ اگر اسلامی تصوراتِ حیات کا مظہر اس قسم کا آئین ہے تو اسلامی نظام کو بے مثل و بے نظیر کیسے کہا جا سکتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان تو ہمیں بلا مزد و معاوضہ مل گیا لیکن اس کے بعد، ہمارے اربابِ حل و عقد اس قسم کے دعاوی سے کہ ہم اس خطۂ زمین کو اسلامی نظامِ زندگی کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے ہیں، ایک عجیب مصیبت میں پھنس گئے۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ جس طرح ہم اس سے پہلے

اپنی تقریروں میں اس قسم کی "شاعری" سے عوام کو خوش کرکے وقت گذار لیا کرتے تھے، اب بھی یہی ہوگا۔ لیکن انہوں نے اس کا احساس نہ کیا کہ اب حالات مختلف ہو چکے ہیں۔ اب خالی "شاعری" سے کام نہیں چلے گا۔ اب ہر مصرع پر عملی گرہ لگانی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس کا بھی احساس نہ کیا کہ بلا سوچے سمجھے "اسلامی دستور" اور "اسلامی نظام" کے دعووں سے وہ ان مفاد پرست گروہوں کے ہاتھ میں کتنا خطرناک حربہ دے رہے ہیں جو مذہب کے نقاب میں اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین کا سامان تلاش کرتے ہیں اور جو اپنی اس شکست کا انتقام جو انہیں قائدِ اعظم رحمہ کے ہاتھوں (حصولِ پاکستان کی شکل میں) ملی تھی، کن کن "مقدس" حیلوں سے لینا چاہتے ہیں۔ یہ تھا ہمارے اربابِ بست و کشاد کا عدم تدبر اور اسلام کے متعلق صحیح علم و تقویٰ کا فقدان جس کی وجہ سے، مملکتِ پاکستان کی آئین سازی کی کشتی، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح آٹھ سال سے ایک ہی مقام پر چکر لگا رہی ہے اور ساحلِ مراد کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ مسودۂ دستور، سابقہ مجلسِ دستور کے سامنے پیش کردہ مسودہ سے کئی اعتبار سے بہتر ہے اور اس میں بعض ترمیمات و اصلاحات بہت اچھی ہیں۔ لیکن، بایں ہمہ، اسے اسلام کی بے مثل و بے نظیر تعلیم کا حامل کہنا تو کسی صورت میں بھی صحیح قرار نہیں پا سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر اس مسودہ کے مرتبین ملک کے سیاسی مذہب پرستوں کی غوغا آرائی سے مرعوب نہ ہو جاتے تو یہ مسودہ اپنی موجودہ شکل سے کہیں بہتر ہوتا۔ اس میں جو خامیاں ہیں وہ صحیح فہم کے فقدان کے مقابلہ میں جرأت اور ہمت کی کمی کی زیادہ غماز ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسودہ کے مرتبین کے ذہن پر یہ خیال غالب تھا کہ ہمیں کیا ضرورت ہے کہ اہم اختلافی معاملات میں فیصلہ کن شقیں رکھ کر خواہ مخواہ کی مخالفت مول لیں۔ ہمیں کسی نہ کسی طرح اس مصیبت کو اپنے سر سے ٹال دینا چاہیئے۔ آنے والے اس کے نتائج خود بھگتیں گے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس آئین کو آئینِ مفاہمت (Constitution of Compromise) کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مذہب اور سیاست میں مفاہمت۔ مُلّا اور حکومت میں مفاہمت۔ اصول اور مصلحت میں مفاہمت۔ مشرق اور مغرب میں مفاہمت۔ اے کاش انہیں معلوم ہوتا کہ حق اپنے مقام پر قائم ہوتا ہے اور اپنے اندر مفاہمت کی ذرا بھی گنجائش نہیں رکھتا۔

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

اس مسودہ میں بیشتر امور تو وہی ہیں جو سابقہ اسمبلی کے مسودہ میں موجود تھے۔ ان امور پر طلوعِ اسلام میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے جسے بالتفصیل دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آئندہ صفحات میں ان نکات کو سامنے لایا جائے گا جن پر تبصرہ ناگزیر ہے۔

قراردادِ مقاصد قراردادِ مقاصد جسے دستورین کا معرکہ آرا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے اور جس کے پاس ہونے کے بعد جماعتِ اسلامی تک نے کہہ دیا تھا کہ اس سے مملکتِ پاکستان مسلمان ہو گئی ہے (اور اس لئے اس کے انتخابات میں حصہ لینا "اقامتِ دین" کی رُو سے جائز قرار پا گیا ہے) جن اسقام سے پُر تھی ان کے متعلق طلوعِ اسلام میں کافی لکھا جا چکا ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "قرآنی دستورِ پاکستان"۔ اس قرارداد کا پہلا فقرہ یہ تھا:

تمام کائنات پر اقتدارِ مطلق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس نے جو اختیارات ملتِ پاکستان کی وساطت سے

مملکتِ پاکستان کو تفویض کئے ہیں وہ ایک مقدس امانت ہیں جنہیں خدا کی متعین کردہ حدود کے اندر استعمال کیا جائے گا۔

طلوع اسلام نے یہ بتایا تھا (اور سارے ملک میں طلوع اسلام نے ایسا کہا تھا) کہ اس میں ایسی بنیادی غلطیاں ہیں جو قرآن کی تعلیم کے یکسر خلاف جاتی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات کسی کو تفویض (DELEGATE) نہیں کیا کرتا۔ یہ ازمنۂ وسطیٰ کا عیسائیت کا پیدا کردہ تصور ہے جس کی رُو سے بادشاہوں کے حقوق خداوندی (DIVINE RIGHTS OF THE KING) کا عقیدہ وضع کیا گیا تھا۔ سابقہ اسمبلی کی سمجھ میں تو ہماری یہ گذارش نہ آئی۔ لیکن اب ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ موجودہ مسودہ کے مرتبین نے اس نقص کو محسوس کر لیا۔ چنانچہ اب اس فقرہ کو یوں بدل دیا گیا ہے۔

تمام کائنات پر اقتدار اعلیٰ صرف خدا کا ہے۔ اور اس کی متعین کردہ حدود کے اندر جو اختیارات مملکتِ پاکستان یہ استعمال کرے گی وہ ایک مقدس امانت ہیں۔

اس ترمیم کے متعلق سر محمد ظفر اللہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ "تفویض" کے لفظ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں۔ لہٰذا اس کی جگہ یہ فقرہ رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ موجودہ فقرہ، سابقہ قرارداد کے مقابلہ میں کہیں بہتر ہے لیکن اس کے دونوں ٹکڑوں میں جنہیں اور (AND) سے ملایا گیا ہے، باہمی ربط کوئی نہیں۔ صاف نظر آتا ہے کہ پہلا ٹکڑہ ایسے ہی لکھ دیا گیا ہے جیسے خطوط پر ۷۸۶ لکھ دیا جاتا ہے جسے خط کے متن سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم نے جو مسودۂ قرارداد مقاصد پیش کیا تھا (ملاحظہ ہو قرآنی دستور پاکستان۔ صفحہ ۹۴) اس کا پہلا فقرہ صحیح مفہوم کا بہتر ترجمان ہے۔ وہ فقرہ یہ ہے۔

ہر گاہ کہ

مسلمانوں کی وجہ جامعیت اسلام ہے اور یہی وہ تصورِ حیات ہے جس کی بنا پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا ہے تاکہ اس مملکت کے باشندے اس مخصوص تصورِ حیات کے مطابق، جس میں اختیار حکمرانی کو ایک مقدس امانت قرار دیا گیا ہے حدود اللہ کے اندر آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔

۲۔۔۔ پیش نظر قرارداد مقاصد کے آخر میں "انگریزی اور ہجری" تاریخیں درج کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہم جس قدر جلد اس کشمکش سے نکل سکیں، اتنا ہی ہماری ذات اور خود مملکت کے لئے مفید ہوگا۔ ہمیں اپنے کاروبار کے لئے کوئی ایک کیلنڈر تجویز کر لینا چاہئے انگریزی (یعنی سن عیسوی) اور ہجری کی یہ ثنویت اچھی نہیں۔ قرآن کی رو سے "چاند اور سورج دونوں حساب و شمار کے لئے پیدا کئے گئے ہیں" اس لئے ہم شمسی اور قمری میں سے جو قاعدہ اپنے ہاں چاہیں، رائج کر سکتے ہیں۔ موجودہ ثنویت کا ایک نقص تو ابھی سے سامنے آگیا ہے۔ بنگال والوں کی طرف سے یہ ترمیم پیش ہو رہی ہے کہ عیسوی اور ہجری تاریخوں کے ساتھ بنگالی سمت کی تاریخیں بھی لکھی جائیں۔ یعنی انگریزی کیلنڈر، حکمران طبقہ کے لئے۔ ہجری کیلنڈر مذہب پرست طبقہ کو خوش کرنے کے لئے اور بنگالی کیلنڈر، مشرقی پاکستان کی رضاجوئی کی خاطر! یا للعجب۔

بنیادی حقوق | مسودۂ زیر نظر کا باب دوم "بنیادی حقوق" پر مشتمل ہے جو کم و بیش، مجلس اقوام متحدہ (U.N.O)

کے منشورِ حقوق پر مبنی ہے۔ اس میں تمام حقوق " موجود ہیں، بجز اس بنیادی حق کے جسے قرآن تمام افرادِ مملکت کا بلاشرط حق قرار دیتا ہے اور وہ حق یہ ہے کہ ہر فردِ مملکت کی تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی (خوراک۔ لباس۔ مکان وغیرہ) اور اس کی مضمر صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے سامان کا بہم پہنچانا مملکت کا فریضہ ہے اور ہر فرد ان چیزوں کو بطورِ استحقاق طلب کر سکتا ہے۔ یاد رکھئے! اگر کسی مملکت میں ایک فرد (مسلم یا غیر مسلم) کسی بنیادی ضرورتِ زندگی سے محروم رہ جائے یا اسے اپنی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے ضروری سامان اور سہولتیں بلامزد و معاوضہ اور بلا تشویش (تردد) میسر نہ ہوں، تو وہ مملکت کبھی اسلامی نہیں کہلا سکتی۔ بنیادی حقوق کی فہرست میں، اس حق کا شامل کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسودہ کے باب سوم میں یہ مذکور ہے کہ مملکت کوشش کرے گی کہ جو لوگ اکتسابِ رزق سے مستقلاً یا عارضی طور پر معذور ہو جائیں، ان کے لئے ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے۔ لیکن یہ باب "اصولِ ہدایت" (Directive principles) سے متعلق ہے، جن کی حیثیت وعظ (SERMON) سے زیادہ کچھ نہیں۔ افرادِ مملکت ان چیزوں کو نہ بطورِ استحقاق طلب کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی بنا پر، مملکت کے خلاف عدالت میں کوئی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا اس بنیادی حق کا "اصولِ ہدایت" میں شامل کرنا محض طفل تسلی ہے۔ قرآن جس حق کو بنیادی اور غیر مشروط قرار دیتا ہے اسے سب سے پہلے فہرستِ حقوق میں شامل ہونا چاہیئے۔ جس کے پورا نہ ہونے پر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جا سکے۔

۲۔ فہرستِ حقوق میں ایک بات بڑی دلچسپ ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کسی شخص کو غلام نہیں بنایا جا سکے گا اور ہر شخص کو حق حاصل ہوگا کہ وہ جونسا مذہب بھی چاہے اختیار کرے۔ اس کے ساتھ ہی، مسودۂ دستور میں یہ بھی مذکور ہے (جس کی بابت ذرا آگے چل کر تفصیلی بحث کی جائے گی) کہ کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جائے گا جو "کتاب و سنت" کے خلاف ہو۔ "کتاب و سنت" کے علمبردار اربابِ شریعت ہمیں بتاتے ہیں کہ اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے۔ ان لونڈیوں سے بلا نکاح اور بلا تعداد جنسی تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں اور پھر انہیں دوسرے کے ہاتھوں فروخت بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مذہب کے متعلق ان کا ارشاد ہے کہ جو مسلمان مذہب تبدیل کرے اس کی سزا موت ہوگی۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ ایک ہی مسودہ میں اس قسم کی متضاد باتیں شامل ہیں۔ لیکن اس سے بھی دلچسپ یہ حقیقت ہے کہ ملک کی مختلف مذہبی جماعتوں اور حضرات علمائے کرام کی طرف سے اس وقت تک مسودۂ دستور کے متعلق (مخالف، موافق) جو کچھ لکھا یا کہا گیا ہے، ان میں ان باتوں کا کہیں ذکر نہیں۔ حالانکہ مودودی صاحب نے غلام اور لونڈیوں کے جواز کے متعلق اپنی کتابوں میں تفصیلی بحث کی ہے اور "مرتد کی سزائے قتل" کے عنوان سے ایک کتابچہ بھی شائع کیا ہوا ہے۔ اور طلوعِ اسلام کے خلاف جو فردِ جرم ان حضرات نے مرتب کر رکھی ہے، اس میں اس کا یہ جرمِ عظیم بھی شامل ہے کہ یہ غلام اور لونڈیوں کو قرآن کی رو سے ناجائز بتاتا ہے اور دین کے متعلق کہتا ہے کہ اس میں کوئی جبر و اکراہ نہیں (لیکن تادمِ تحریر جو کچھ ہماری نظروں سے گذرا ہے اس میں) مودودی صاحب نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ دونوں شقیں اسلام کے خلاف ہیں اس لئے انہیں مسودہ سے حذف کر دینا چاہیئے۔ آپ نے غور فرمایا کہ یہ حضرات ایک ایسے معاملہ میں، جو ان کے نزدیک بہت اہم ہے، یوں خاموش

کیوں ہیں؟ اس لئے کہ دستور کے متعلق ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ دلچسپی لے رہا ہے اس وقت یہ کہنا کہ غلامی جائز ہے اور مسلمان کو تبدیلیٔ مذہب کی اجازت نہیں دی جا سکتی، ان حضرات کو تعلیم یافتہ طبقہ میں غیر مقبول بنا دے گا۔ اس لئے ان کی "دینی مصلحت" کا تقاضا یہی ہے کہ اس وقت یہ بات ہی نہ چھیڑی جائے۔

اصولِ ہدایت

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس حصہ (باب سوئم) میں جو کچھ درج ہے، اس کی حیثیت قانونی نہیں بلکہ محض مشاورتی قسم کی ہے۔ یعنی اگر مملکت ان امور کی تکمیل کے لئے کچھ نہ کرے تو بھی اس سے اس کے متعلق کوئی بازپرس نہیں کی جا سکتی۔ اس سے ان امور کی حیثیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس میں منجملہ دیگر امور کہا گیا ہے کہ ایسے اقدامات کئے جائیں گے جن کی رُو سے مسلمانانِ پاکستان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کے قالب میں ڈھال سکیں۔ یہ وہ بنیادی فریضہ ہے جس کے لئے ایک اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے۔ لیکن اس فریضہ کو "اصولِ ہدایت" میں جگہ دی گئی ہے نہ کہ دستور کے متن میں۔

۲۔۔۔اس باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ مملکت اس کی کوشش کرے گی کہ وہ زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی باقاعدہ تنظیم کرے اس سے صاف نظر آتا ہے کہ اس مسودہ کے مرتب کرنے والوں کے ذہن میں اسلام کا وہی نقشہ ہے جو انہیں مُلّا نے تشکّل کر کے دیا ہے۔ ورنہ اگر اُن کے سامنے صحیح اسلام ہوتا تو وہ اس قسم کی مضحکہ انگیز باتیں کبھی نہ کرتے (اور اگر ان کے سامنے اسلام کا صحیح تصور ہے تو ظاہر ہے کہ یہ شق محض مُلّاؤں کو خوش کرنے کے لئے رکھی گئی ہے) یہ ظاہر ہے کہ اسلام کی رُو سے زکوٰۃ اسلامی مملکت کے حاصل (آمدنی) کو کہتے ہیں جن سے وہ افرادِ معاشرہ کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ اس تصور کی رُو سے یہ کہنا کہ مملکت "زکوٰۃ" کی تنظیم کرے گی ایک بے معنی بات ہے۔ لیکن مُلّا کے اسلام کی رُو سے، زکوٰۃ، ایک مذہبی ٹیکس ہے (جس سے حکومت کو کچھ واسطہ نہیں) یہ حکومت کے ٹیکس سے الگ ہے۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ جس طرح وہ اپنے ٹیکس جمع کرتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ بھی جمع کرے لیکن اسے اپنے خزانہ میں داخل نہ کرے کیونکہ اس طرح "مذہب اور سیاست" دونوں کا روپیہ ایک جگہ جمع ہو جائیگا۔ اور زکوٰۃ کا مقدس اور مطہر روپیہ پلید ہو جائے گا۔ اس روپے کو الگ رکھا جائے اور صرف "مذہبی امور" پر صرف کیا جائے۔ یہی وہ روپیہ ہے جس پر چھاپہ مارنے کے لئے ہمارے علماء کرام اسلامی نظام کے لئے اس قدر نعل بر آتش ہو رہے ہیں۔

باقی رہے اوقاف، سو قرآن کی رُو سے وقف کی دینی حیثیت ہی کچھ نہیں بلکہ یہ قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ وقف کے معنی یہ ہیں کہ مرنے والا اپنی موت کے بعد بھی اپنی جائیداد پر اپنی ملکیت قائم رکھتا ہے۔ کیونکہ اس جائیداد کی آمدنی اس کی وصیت کے مطابق ہی صرف کی جا سکتی ہے قرآن اس کی کبھی اجازت نہیں دے سکتا کہ ایک مردہ زندہ انسانوں پر اس طرح حکومت کرے لیکن چونکہ اوقاف "مذہبی پیشواؤں کی بڑی جاگیر ہوتے ہیں اس لئے وہ انہیں شریعت حقہ کا ضروری جزو قرار دیتے ہیں۔ اب اس مذہبی جاگیرداری کو اسلامی مملکت کی طرف سے قانونی سند بھی حاصل ہو جائے گی۔

باقی رہی مساجد کی تنظیم، سو معلوم ہوتا ہے کہ مرتبین مسودہ کے نزدیک مساجد کی حیثیت محض پرستش گاہوں کی ہے، حالانکہ

اسلامی معاشرہ میں مساجد وہ مراکز ہیں جن میں ملّت کی اجتماعی تنظیم ہوتی ہے۔

۳۔ اصولِ ہدایت میں یہ بھی لکھا ہے کہ مملکت اس کی کوشش کرے گی کہ عصمت فروشی، قمار بازی اور مسکرات کا استعمال ممنوع قرار دے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان تین نواہی کو خاص طور پر الگ، بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ خود متنِ آئین میں یہ شق موجود ہے کہ ملک میں کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جائے گا جو کتاب و سنّت کے خلاف ہو اور موجودہ قوانین کو ایک مدت معینہ کے اندر اندر کتاب و سنّت کے مطابق کر لیا جائے گا۔ کیا ان قوانین کی رُو سے بھی جو مذکورہ ہدایت کے مطابق مرتب ہوں گے۔ زنا، جوا، اور نشہ آور چیزوں کا استعمال خود بخود ممنوع نہیں قرار پا جائے گا؟ اندریں حالات ان فواحش کا خاص طور پر ذکر کرنا کیا غیر شعوری طور پر اس پروپیگنڈہ کا اثر تو نہیں جو جماعت اسلامی کی طرف سے برسرِ اقتدار طبقہ کے خلاف کیا جاتا ہے اور جس میں کہا جاتا ہے کہ اس طبقہ میں زنا۔ جوا اور شراب عام ہے۔

۴۔ اصولِ ہدایت میں یہ بھی درج ہے کہ مملکت عوام کی مرفہ الحالی کے لئے کوشش کرے گی اور دولت اور وسائل پیداوار کو چند افراد کے ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکے گی۔ اور زمینداروں اور کاشتکاروں کے حقوق میں توازن پیدا کرے گی۔

قرآن جس معاشی نظام کو پیش کرتا ہے اس کی رو سے دولت کا اکتناز یا وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت جائز ہی نہیں۔ ان وسائل پیداوار میں زمین کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ درحقیقت قرآن میں **ارض** کی اصطلاح استعمال ہی وسائل پیداوار کے لئے ہوئی ہے۔ سو جو امور قرآن کی رُو سے جائز ہی نہیں، ان کے متعلق یہ کہنا اور وہ بھی اصولِ ہدایت میں نہ کہ متنِ دستور میں، کہ مملکت ان میں اصلاح کی کوشش کرے گی، قرآنی نظامِ معیشت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ ایک اسلامی مملکت کے دستور میں اس شق کو بنیادی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے کہ (زمین سمیت) وسائل پیداوار ملّت کی مشترکہ تحویل میں رہیں گے۔ تاکہ مملکت تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کے نشو و نما کے لئے سامان و ذرائع مہیا کرسکے۔

۵۔ اصولِ ہدایت میں یہ بھی لکھا ہے کہ مملکت ایک قومی زبان کی تشکیل و نشو و نما کے لئے ضروری اقدامات کرے گی۔

کیا پاکستان میں اس وقت کوئی قومی زبان موجود نہیں کہ مملکت کو ایک نئی زبان کی تلاش اور نشو و نما کی ضرورت لاحق ہوگی؟ کیا اردو پاکستان کی قومی زبان نہیں ہے؟

صدرِ مملکت

غنیمت ہے کہ صدر مملکت اور نائب صدر کے لئے مسلمان ہونے کی شرط عائد کر دی گئی ہے۔ لیکن ان کے لئے تعلیم یافتہ ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ (سابقہ اسمبلی کے مسودہ میں نوشت و خواند کی شرط رکھی گئی تھی لیکن موجودہ مسودہ میں اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی) جب صدر مملکت کے لئے تعلیم کی شرط ضروری نہیں سمجھی گئی تو پھر اس سے نیچے کسی اور کے لئے اس قسم کی شرط کس طرح رکھی جاسکتی تھی؟ چنانچہ نہ رائے دہندگان کے لئے تعلیم کی شرط ہے اور نہ ہی مجالسِ آئین ساز کے امیدواروں کے لئے (خواہ وہ صوبائی مجلس ہو یا مرکزی)۔ ٹھیک ہے! حکومت یا قانون سازی کے لئے تعلیم کیا ضروری ہے؟ بالآخر مہاراجہ رنجیت سنگھ نے حکومت چلا ہی لی تھی؟ ویسے بھی، ملک میں تعلیم کا جو کچھ انتظام ہے اس کی رُو سے، ایک آدھ نسل کے بعد یہاں پڑھا لکھا آدمی ملے گا ہی بمشکل۔

۳۔۔۔ مسودہ میں (سابقہ اسمبلی کے رپورٹ کی طرح) یہ درج ہے کہ مجلس مقننہ اپنے پاس کردہ بل کو صدر کے پاس منظوری کے لئے بھیجے گی۔ صدر اس بل کو ایک دفعہ تو بلا منظوری واپس کر سکتا ہے لیکن دوسری مرتبہ اسے اس کے نیچے صاد کرنا ہی ہوگا۔ ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں، اور آج پھر دہراتے ہیں کہ اگر صدر کو محض ایک (Signing Machine) ہی بننا ہے تو اس تکلف کی ضرورت کیا ہے؟ یا تو صدر کو وہ اختیارات دینے چاہئیں جس کا وہ مستحق ہے اور یا اس منصب ہی کو ختم کر دینا چاہیئے۔

مرکزی مقننہ مسودہ میں کہا گیا ہے کہ مرکزی مجلس آئین ساز کا سال میں ایک اجلاس ڈھاکہ میں بھی ہوا کرے۔ ہم واضعین مسودہ سے پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا کی کسی اور مملکت میں بھی اس کی مثال موجود ہے کہ مرکزی مجلس قانون ساز کے اجلاس مختلف وحدتوں میں ہوں؟ روس اور امریکہ بڑی وسیع مملکتیں ہیں۔ کیا ان کے ہاں بھی دستور میں ایسی شق موجود ہے، کہ مرکزی مجلس کا اجلاس، مملکت کے دارالسلطنت کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی ہوا کرے؟ ظاہر ہے کہ یہ شق محض مشرقی پاکستان کے انتشار پسند عنصر کی رضا جوئی کی خاطر رکھی گئی ہے۔ لیکن ہم اپنے ان سادہ لوح بھائیوں کو یقین دلاتے ہیں کہ انتشار پسند طبقہ کبھی ایسی باتوں سے مطمئن نہیں ہوگا! چنانچہ ان کی طرف سے ایک تجویز یہ بھی پیش کر دی گئی ہے کہ دارالسلطنت، کراچی کے بجائے ڈھاکہ بنا دیا جائے۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ دارالسلطنت ڈھاکہ کو قرار دیا جائے۔ لیکن اس قسم کی مضحکہ انگیز صورت تو نہ پیدا کیجئے کہ مرکزی مجلس کا اجلاس ایک بار مشرق میں ہوا کرے اور ایک بار مغرب میں۔ مرکزی مجلس کے اجلاس، دارالسلطنت ہی میں ہونے چاہئیں۔

صوبائی گورنر باب پنجم میں گورنروں کے لئے صرف پاکستان کا شہری ہونے کی شرط مذکور ہے۔ نہ اس کے لئے مسلمان ہونے کی شرط ہے اور نہ ہی تعلیم یافتہ ہونے کی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب مملکت کے صدر اور نائب صدر کے لئے مسلمان ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے، تو صوبوں کے گورنروں کے لئے اس قسم کی شرط کیوں نہیں رکھی گئی؟ جس اصول کے مطابق، صدر کے لئے مسلمان ہونا ضروری سمجھا گیا ہے، اس اصول کے مطابق صوبائی گورنر (بلکہ ہر کلیدی منصب) کے لئے مسلمان ہونے کی شرط ضروری ہے۔ یاد رکھئے! قرآن کی رُو سے، ایک اسلامی مملکت کے کاروبار میں، کسی غیر مسلم کو شریک راز نہیں کیا جا سکتا۔ جس مملکت کی بنیاد کسی آئیڈیولوجی پر ہوگی، اس میں اس قسم کی شرط ناگزیر ہوگی۔ باقی رہی ہندوؤں کی خوشنودی۔ سو وہ کبھی خوش نہیں ہو سکتا جب تک آپ (پناہ بخدا) پاکستان کی جداگانہ مملکت کو ختم کر کے اسے ہندوستان کے ساتھ نہ ملا دیں!

مالیات سابقہ اسمبلی کے مسودہ۔۔۔۔ دستور میں لکھا تھا کہ مالیات سے متعلق امور پچیس سال تک قرآن و سنت کے حدود سے باہر رہیں گے۔ مقامِ شکر ہے کہ زیرِ نظر مسودہ میں اس قسم کا استثناء نہیں۔

انتخابات اس وقت، مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا مسئلہ ارباب حل و عقد کے لئے گلے کا ہار بن رہا ہے۔ انہوں نے اس مشکل کا حل یہی سمجھا ہے کہ اس سوال کو مسودۂ آئین میں چھیڑا ہی نہ جائے۔ دیکھا آپ نے کبوتر اپنی آنکھیں بند کر لینے سے کس طرح بلی کے جھپٹنے سے بچ جاتا ہے! یہ ہمارے اربابِ اقتدار کی کمزوری ہے۔ ورنہ ایک اسلامی مملکت میں مخلوط انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ جو شخص اسلامی آئیڈیولوجی کو تسلیم ہی نہیں کرتا وہ ان کا نمائندہ کس طرح بن سکتا ہے جن کے لئے یہ آئیڈیولوجی جزوِ زندگی

اور سرمایۂ آخرت ہے۔

ہمیں بھلا اُن سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہتے ہیں ؟

لیکن ہمارے اربابِ بست وکشاد ہیں کہ وہ اس خیال سے آنکھیں بند کر کے آگے گذر جانے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ دنیا میں "ان چوڑ رفاقتوں" کو نبھانے کے لئے انسان کو کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے؟ اسی لئے تو قرآن نے اس قسم کی رفاقتوں سے منع کیا ہے۔

عمالِ حکومت ہمیں افسوس ہے کہ اس عنوان کے ماتحت مسودہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کم و بیش موجودہ قوانین ہی کا چربہ ہے، حالانکہ جیسا کہ ہم پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں، (SERVICES) کے متعلق موجودہ قوانین اس قدر ناقص ہیں کہ ان کی رُو سے ایک ملازمِ سرکار، اور عہدِ استبداد کے غلام میں چنداں فرق نہیں رہتا۔ ان قوانین کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان کی رُو سے ایک ملازمِ سرکار کے لئے دادفریاد کے لئے کوئی دروازہ ہی کھلا نہیں رہتا۔ اس کے استغاثہ اور مرافعہ دونوں میں، خود فریقِ مقابل (یعنی اس کا دفتر) جج کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جب مقدمات کے فیصلے اس طرح ہوں کہ ایک فریق خود ہی جج بن جائے تو ان فیصلوں کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے

۲۔ عمالِ حکومت کے سلسلہ میں یہ شرط بھی لازمی قرار دینی چاہیئے کہ تمام اسامیوں پر تقرر، مقابلہ کے امتحان کے نتیجہ پر ہوگا اور صوبائی تناسب یا نامزدگی کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ ملک میں نااہلی اور صوبائی تعصب کی سب سے بڑی وجہ ہمارا وہ افسوسناک قانون ہے جس کی رُو سے اسامیوں میں مختلف صوبوں کا تناسب رکھا گیا ہے۔ اس اصول تناسب نے ملک کو تباہی کے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ زیرِ نظر مسودہ میں اس لعنت کو ممنوع قرار دینے کی کوئی شق نہیں۔ ایسی شق کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

اسلامیات اب ہم مسودہ کے سب سے اہم حصہ کی طرف آتے ہیں۔ یعنی باب دوازدہم کی طرف، جس کا پہلا حصہ اسلامیات سے متعلق ہے۔ اس میں پہلی شق یہ ہے کہ

صدرِ مملکت ایک ایسا ادارہ قائم کرے گا جو جمیع اسلامی خطوط پر معاشرہ کی تشکیل کے کام میں معاونت کرے۔

یہ بڑی عمدہ تجویز ہے بشرطیکہ اس ادارہ کے ارکان کے تقرر میں مذہبی مفاد پرستوں کی غوغا آرائی یا کسی کے ذاتی تعلقات اثر انداز نہ ہو گئے۔ لیکن اگر اس ادارہ میں رجعت پسندانہ عنصر گھس آیا تو مملکت کے لئے اس سے زیادہ تباہ کن چیز بھی کوئی اور نہیں ہوگی۔ ہمیں یہ خدشہ اس لئے لاحق ہو رہا ہے کہ ہمارے اربابِ بست وکشاد میں جُرأت کی کمی ہے اور وہ اسی میں اپنی عافیت دیکھتے ہیں کہ مذہب پرست طبقہ ان کا مخالف نہ ہونے پائے۔ ورنہ وہ دل سے اس طبقہ کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور آرزومند ہیں کہ یہاں وہی اسلام برگ و بار لائے جسے خدا نے نوعِ انسانی کے لئے بطور ضابطۂ حیات تجویز کیا تھا اور جس سے ہم اقوامِ عالم کی امامت کے سزاوار ہو سکتے ہیں۔ اگر خدا انہیں تھوڑی سی ہمت عطا کر دے تو ایسا ہونا کچھ بھی مشکل نہیں۔

کتاب و سُنّت یہ ہے سارے مسودہ میں اہم ترین اور نازک ترین گوشہ۔ شق ۲۰۵ میں مرقوم ہے کہ

ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو ان احکامِ اسلامی کے خلاف ہو جو قرآن و سنت میں مندرج ہیں۔ نیز موجودہ قوانین کو قرآن و سُنّت کے مطابق مرتب کیا جائے گا۔

اس شق پر حسب ذیل طریقے سے عمل درآمد کیا جائے گا۔ یعنی دستور نافذ ہونے کے ایک سال کے اندر، صدر مملکت ایک ایسا کمیشن مقرر کرے گا جو

(ا) مرکزی اور صوبائی مجالسِ مقننہ کی راہ نمائی کے لئے، کتاب و سنت کے مطابق قوانین کی ایسی فہرست مرتب کرے جسے قانونی حیثیت دی جا سکے۔ اور

(ب) اس امر کی سفارش کرے کہ

(ا) ان احکام اسلامی کی تنفیذ کے لئے کیا کیا قدم اٹھائے جائیں اور انہیں کس طرح بتدریج نافذ کیا جائے۔ اور

(اا) موجودہ قوانین کو احکام اسلامی کے مطابق کس طرح متشکل کیا جائے۔

یہ کمیشن، اپنے یوم تقرر کے پانچ سال کے اندر اپنی رپورٹ پیش کر دے گا یہ رپورٹ چھ ماہ کے اندر مرکزی مقننہ کے سامنے رکھ دی جائیگی۔ یہ مجلس اس رپورٹ پر غور و خوض کرنے کے بعد ان قوانین کو نافذ کرے گی۔

یہ مسئلہ اہم ترین اس لئے ہے کہ کسی معاشرہ کے مستقبل کا مدار ہی اس پر ہوتا ہے کہ اس میں قوانین کس قسم کے رائج ہوتے ہیں۔ اور نازک ترین اس لئے کہ بدقسمتی سے ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے کہ اس قسم کے مسائل کو جذبات سے الگ ہٹ کر سوچا ہی نہ جائے۔ طلوع اسلام نے اس خالص دینی اور علمی سوال کو اٹھایا تھا کہ ہمیں متعین کرنا چاہیئے کہ سنت رسول اللہؐ کہتے کسے ہیں؟ ہمارے ارباب شریعت کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی کے پاس کسی معقول بات کا کوئی جواب نہ ہو تو وہ کیا کیا کرتا ہے؟ وہ گالیوں پر اُتر آیا کرتا ہے۔ چونکہ مولوی صاحبان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے وہ بھی گالیوں پر اُتر آئے۔ اور طلوع اسلام کو منکرِ سنت۔ منکرشانِ رسالت۔ ملحد۔ بے دین۔ مرتد۔ اور نہ معلوم کیا کیا کہہ ڈالا۔ ہم ان تمام گالیوں کے باوجود) اسے پھر دہراتے ہیں کہ جب تک آپ اسے متعین نہ کر لیں کہ سنت کہتے کسے ہیں اور اس کا مقام کیا ہے، اس وقت تک دستور کی یہ اہم ترین اور بنیادی شق کبھی قابل عمل نہیں ہو سکے گی۔

بعض باتیں بڑی تعجب انگیز ہوتی ہیں۔ جب آپ سے کوئی پوچھے کہ سنتِ رسول اللہ کسے کہتے ہیں تو یہ سوال آپ کو بڑا تعجب انگیز نظر آئے گا۔ آپ کہدیں گے کہ سنت رسول اللہؐ حضور نبی اکرمؐ کے طریقۂ زندگی کو کہتے ہیں۔ یہ جواب عمومی اور نظری طور پر تو صحیح ہے، لیکن جب آپ یہ کہیں کہ ملک کا کوئی قانون قرآن اور سنت کے خلاف نہیں بنے گا اور موجودہ قوانین کو قرآن اور سنت کے مطابق بنایا جائے گا، تو اس وقت آپ کا مذکورہ صدر جواب کافی نہیں ہوگا۔ اس وقت ضروری ہوگا کہ یہ متعین طور پر معلوم ہو کہ حضور کا طریقۂ زندگی کیا تھا۔ وہ اب کس کتاب میں درج ہے۔ وہ کتاب، قرآن کے ساتھ، مجلس مقننہ کی سرکاری لائبریری میں مستند طور پر موجود ہونی چاہیئے۔ اس کی کاپیاں تمام عدالتوں میں رہنی چاہئیں۔ تاکہ جب اور جہاں یہ سوال اٹھے کہ فلاں قانون سنت کے مطابق ہے، یا نہیں تو آپ اس کتاب کو اٹھا کر دیکھ سکیں کہ اس میں اس معاملہ کے متعلق کیا لکھا ہے۔ مسٹر چندریگر نے اپنی تقریر میں کہا ہے (اور خود مسودہ آئین بھی اس کی تائید کرتا ہے) کہ اس بات کا

فیصلہ کہ فلاں قانون کتاب و سُنّت کے مطابق ہے یا نہیں، مجلس مقننہ کرے گی۔ یہ چیز بڑی عمدہ ہے اور اسلام کی صحیح تعلیم کے مطابق (اگرچہ جماعت اسلامی کی اب بھی تجویز یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے سپریم کورٹ کی طرف رجوع کیا جائے اور اس کی معاونت کے لئے علماء کا بورڈ بنایا جائے) لیکن اس کے لئے یہ بھی تو ضروری ہے کہ مجلس مقننہ کے ہر رکن کے پاس (قرآن کے ساتھ) وہ کتاب بھی ہو جس میں سُنّتِ رسول اللہ اسی مستند طریقہ سے درج ہو جس طرح قرآن میں اس کی آیات درج ہیں۔ ہم نے ایک عرصہ ہوا یہ سوال اٹھایا تھا اور حضرات علمائے کرام سے پوچھا تھا کہ وہ بتائیں کہ سُنّتِ رسول اللہؐ کسے کہتے ہیں اور وہ کس کتاب میں ملے گی۔ اس کا جواب آج تک کسی نے نہیں دیا (البتہ گالیاں ہر ایک نے دی ہیں)۔ اگر آپ چاہیں تو اس باب میں آپ خود کوشش کر دیکھئے۔ آپ کی سہولت کی غرض سے ذیل میں ہم ایک سوال نامہ درج کرتے ہیں۔ آپ جن علمائے کرام سے مناسب سمجھیں، اس سوالنامہ کا جواب لے کر ہمیں بھیجدیں نتیجہ آپ کے سامنے آجائے گا۔

سوال نامہ

(۱) سنت رسول اللہؐ سے مراد کیا ہے۔

(۲) کیا حدیث اور سنت میں کچھ فرق ہے۔ اگر فرق ہے تو کیا۔

(۳) کیا رسول اللہؐ کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک ذاتی اور دوسری حیثیتِ رسالت۔ یا آپ نے ساری عمر جو کچھ کیا یا کہا وہ رسول اللہؐ ہی کی حیثیت سے تھا۔

(۴) اگر رسول اللہؐ کی ذات اور رسالت کی حیثیتیں الگ الگ تھیں تو کیا سُنّت میں صرف وہ باتیں شامل ہوں گی جو آپ نے بہ حیثیت رسول کیں یا وہ بھی جو اپنی ذاتی حیثیت سے کیں۔ مثلاً رہنے سہنے کا طریق۔ کھانے پینے اور وضع قطع کا انداز وغیرہ۔

(۵) اگر سُنّت میں صرف وہی امور شامل ہیں جو حضورؐ نے بہ حیثیت رسول کئے تھے تو کیا یہ تفریق کہیں پہلے سے موجود ہے کہ آپ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول کی تھی اور فلاں بات ذاتی حیثیت سے۔

(۶) اگر سوال نمبر (۵) کا جواب نفی میں ہو تو اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ آپ نے کون سی بات بہ حیثیت رسول کی تھی اور کونسی ذاتی حیثیت سے۔

(۷) جن امور کو آپ رسول اللہؐ کی سُنّت قرار دیتے ہیں

(الف) وہ کس کتاب میں درج ہیں۔

(ب) کیا اس کتاب کو خود رسول اللہؐ یا آپ کے خلفائے راشدین میں سے کسی نے مرتب کیا تھا۔

(ج) اگر (ب) کا جواب نفی میں ہو تو اسے کس نے مرتب کیا تھا اور کب۔

(د) کیا اس کتاب میں جو کچھ درج ہے وہ ایسا ہے کہ اسے (آیاتِ قرآنی کی طرح) من و عن تسلیم کر لیا جائے یا اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں جن پر تنقید کی جا سکتی ہے۔

(ہ) اس کی تفریق کس طرح کی جائے گی کہ اس میں کونسی بات من و عن تسلیم کرنے کے قابل ہے اور کونسی ایسی ہے جس پر تنقید کی جا سکتی ہے۔

(و) تنقید کرنے کا حق کسے حاصل ہے۔

(۸) پیرہ (۷۔ الف) میں جس کتاب کا نام آپ نے لکھا ہے کیا اسے مسلمانوں کے سب فرقے تسلیم کرتے ہیں۔ یا ایسے فرقے بھی ہیں جن کے نزدیک وہ مستند قرار نہیں پاتی۔

(۹) جن امور کو آپ سُنّتِ رسول اللہ سمجھتے ہیں کیا ان میں ایسے امور بھی ہیں جنہیں اور لوگ جو سُنّتِ رسول اللہؐ کے قائل ہیں صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

(۱۰) اگر پیرہ (۹) کا جواب اثبات میں ہے تو اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ آپ دونوں میں سے کس کی بات صحیح ہے۔

(۱۱) جس بات کو آپ سُنّتِ رسول اللہ سمجھتے ہیں اگر کوئی شخص اس کے خلاف کسی بات کو سُنّتِ رسول اللہؐ سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو تو آپ کے نزدیک وہ شخص متبعِ سُنّت ہوگا یا نہیں۔

(۱۲) جس بات کو آپ سُنّتِ رسول اللہؐ سمجھتے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک کسی کو انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے اس کا حق حاصل ہے کہ اس میں کسی قسم کا ردو بدل کر سکے۔

❋ ❋ ❋ ❋ ❋ ❋

ہم نے اس سوالنامہ کی نقول، مجلس دستور ساز کے اراکین کے پاس بھی بھیجی ہیں کہ وہ بھی اپنے اطمینان کی خاطر، علمائے کرام سے اس کا جواب حاصل کر لیں تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جسے تسلیم شدہ فرض کر کے آگے بڑھا جائے۔ صرف علمائے کرام سے نہیں، بلکہ وہ مسودۂ دستور کے مرتبین سے بھی دریافت کریں کہ آپ نے جب مسودہ میں سنّت کا لفظ لکھا ہے تو اس سے آپ کی مراد کیا ہے۔ واضح رہے کہ مسودہ میں ایک باب ایسا بھی ہے جس میں مختلف الفاظ اور اصطلاحات کی (DEFINITIONS) دی ہوئی ہیں۔ اس میں بھی سنّت کی کوئی (DEFINITION) نہیں دی گئی۔

سنّت کے متعلق طلوعِ اسلام کا جو نظریہ ہے، اس سے قارئین اچھی طرح واقف ہیں اس لئے اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ دیکھئے گا کہ مختلف تجربے کر لینے کے بعد اُمّت کو ایک دن اسی نظریہ کی طرف آنا پڑے گا اس لئے کہ وہی نظریہ خدا اور رسولؐ کے منشاء کے مطابق ہے۔ وہی خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں اُمّت کا مسلک رہا ہے اور اسی سے ہم حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اس نظریہ سے ہمارے اربابِ حل و عقد کا کثیر طبقہ اب بھی متفق ہے لیکن (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) وہ رجعت پسندانہ عنصر کے پروپیگنڈہ سے اس قدر مرعوب ہو چکے ہیں کہ اسے پیش کرنے کی جرأت نہیں کر پاتے۔ اس لئے ہمیں خدشہ یہ ہے کہ ملک کا

نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ۔ اس رجعت پسندانہ مسلک سے تنگ آ کر خود دین ہی سے برگشتہ اور ایسا کہ اب بھی کہیں کہیں سے آوازیں اٹھتی ہیں) پاکستان میں "خالص دنیاوی" (SECULAR) انداز کی حکومت قائم کرنے کے درپے نہ ہو جائے۔ یہ بڑا تباہ کن فیصلہ ہوگا لیکن اگر ہم نے مُلّا کو اسی طرح آگے بڑھنے دیا جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے، تو ایسا ہو کر رہے گا۔ یٰلیتنی متُّ قبل ھٰذا وکنت نسیًا منسیا۔

فرقہ پرستی

کتاب و سنت کے ضمن میں سب سے زیادہ افسوسناک، دردانگیز اور تباہ کن شق وہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جہاں تک شخصی قوانین (PERSONAL LAW) کا تعلق ہے، "قرآن و سنت" کا مفہوم وہ لیا جائے گا جو اس فرقہ کے نزدیک قابلِ قبول ہو جس سے وہ خود متعلق ہے۔

یہ شق سابقہ مجلس دستور ساز کے مسودہ میں بھی موجود تھی۔ پھر "اکتیس علمائے کرام" نے جو اسلامی دستور کا مسودہ مرتب فرمایا تھا اس میں بھی اسے شامل کیا گیا تھا اور اب زیرِ نظر مسودہ میں بھی یہ موجود ہے۔

طلوعِ اسلام میں اس یکسر غیر قرآنی (بلکہ خلافِ قرآن) شق کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جسے تفصیلاً دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مختصراً یہ سمجھئے کہ قرآن کی رُو سے شخصی اور غیر شخصی معاملات کی تفریق ہی غلط ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی، شخصی اور غیر شخصی، ہر قسم کے معاملاتِ زندگی کے لئے ضابطۂ حیات ہے اور اس کی تنفیذ و تعبیر کے لئے جو طریق غیر شخصی معاملات کے لئے ہے وہی شخصی معاملات کے لئے ہے۔ یہ تفریق اس زمانہ میں پیدا ہوئی تھی جب ہمارے دورِ ملوکیت میں اجتماعی (سیاسی) معاملات حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لئے اور غیر سیاسی امور اربابِ شریعت کے سپرد کر دیئے۔ مذہب و سیاست کی یہ غیر قرآنی ثنویت انگریزوں کی محکومی کے زمانہ تک قائم رہی۔ اس لئے حکومت سیاسی قوانین خود وضع کرتی تھی اور مذہبی آزادی کا دائرہ شخصی قوانین تک محدود تھا۔ لیکن کس قدر عبرت اور ندامت کا مقام ہے کہ آج ہم ثنویت کو اپنے اسلامی نظام کا جزو قرار دے رہے ہیں۔ مُلّا کی سمجھ میں تو یہ بات آ نہیں سکتی۔ (اور ان میں سے جن کی سمجھ میں یہ بات آ سکتی ہے، ان کی ذاتی مفاد پرستیاں، انہیں اعترافِ حقیقت کی اجازت نہیں دیتیں) لیکن ہم حیران ہیں کہ ہمارا اربابِ بست و کشاد کا طبقہ بھی اسی ثنویت کی رَو میں بہے چلا جا رہا ہے۔

دوسری چیز، مختلف فرقوں کا وجود ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ قرآن کی رُو سے، فرقہ بندی شرک ہے۔ پھر سُن لیجئے کہ قرآن نے بنصِ صریح، فرقہ سازوں کو مشرک قرار دیا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا (۳۰/۳۲) "مسلمانو! دیکھنا تم مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن گئے۔" وہ رسول اللہ سے واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ اِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (۶/۱۵۹) "جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن گئے، تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔" یہ ہے قرآن کی رُو سے فرقہ سازی کی حیثیت۔ آپ غور کیجئے کہ آپ ایک اسلامی آئین مرتب کر رہے ہیں اور اس میں فرقوں کے وجود کو قانونی سند عطا فرما رہے ہیں! کیا اس قسم کے آئین کو اسلام سے کچھ بھی واسطہ ہو سکتا ہے؟

نہیں! آپ اتنا ہی نہیں کر رہے کہ فرقوں کے وجود کو قانونی سند عطا کر رہے ہیں۔ آپ اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی کر رہے ہیں۔ اس وقت

ملک میں ایسے لوگ موجود ہیں جو قرآنی حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر، اپنے آپ کو صرف مسلمان سمجھتے اور مسلمان کہتے ہیں، وہ اپنے آپ کو کسی فرقے سے متعلق نہیں رکھتے۔ وہ اس قسم کے تعلق کو از روئے قرآن شرک سمجھتے ہیں۔ اب فرض کیجیئے کہ اس قسم کے کسی مسلمان کا کوئی شخصی معاملہ کسی عدالت کے سامنے آیا۔ اس عدالت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس معاملہ کا فیصلہ اس تعبیر کے مطابق کرے جو اس فرقہ کے نزدیک قابل قبول ہے جس سے یہ شخص متعلق ہے۔ اس کے لئے عدالت اس سے دریافت کرے گی کہ وہ کس فرقہ سے متعلق ہے۔ وہ کہے گا کہ میں کسی فرقہ سے متعلق نہیں۔ میں صرف مسلمان ہوں۔ اس "مسلمان" کے مقدمہ کے فیصلے کے لئے عدالت کے پاس کوئی قانون ہی نہیں ہوگا۔ اس صورت میں اس کے لئے اس کے سوا اور چارہ کار کیا ہوگا کہ وہ یا تو اپنے دعوے سے دستبردار ہو جائے اور یا اپنے آپ کو کسی فرقے سے متعلق کہہ کر مسلم سے پھر مشرک بنے۔ سوچئے کہ یہ اسلامی آئین آپ کو کدھرے جا رہا ہے؟ کہا جائیگا کہ جب فرقے موجود تھے پھر بھی اسلام ایک مسلمہ حقیقت تھا لیکن اگر ان کا وجود، قرآن کے خلاف ہے تو ایسی شکل پیدا کرنی چاہیئے جس سے یہ رفتہ رفتہ مٹ جائیں نہ ایسی شکل جس سے یہ بندھن اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے۔ اگر کسی مریض کے جسم میں تپ دق کے جراثیم موجود ہوں تو معالج کا کام انہیں تلف کرنا ہوگا نہ کہ ایسی ادویات دینا جن سے ان کی پرورش ہو۔

کہہ دیا جائے گا کہ صاحب! اس مشکل کا کوئی حل ہی نہیں۔ لیکن ایسا کہنے والے ذرا سوچیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ ساری دنیا سے یہ کہتے ہیں کہ تمام نوع انسانی کی مشکلات کا حل اسلام پیش کرتا ہے، لیکن خود اپنے متعلق آپ کا اعلان یہ ہے کہ ہماری مشکل کا حل اسلام بھی پیش نہیں کر سکتا۔ غور کیجیئے کہ اس کے بعد دنیا آپ کے اس دعوے کے متعلق کیا کہے گی کہ اسلام تمام انسانوں کی مشکلات کا واحد اور مکمل حل پیش کرتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلام میں تو اس مشکل کا حل موجود ہے (اور اسلام سے ہماری مراد ہے وہ دین جسے اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کے لئے تجویز کیا تھا اور جو اس کی کتاب میں ابدی طور پر محفوظ ہے۔ نہ کہ انسانوں کا خود ساختہ اسلام) لیکن ہم اس کا حل چاہتے ہی نہیں۔ مولوی اس کا حل نہیں چاہتا کہ فرقے مٹ جانے سے خود اس کا وجود مٹ جاتا ہے۔ اور "مسٹر" اس کا حل نہیں چاہتا کہ اس سے مولوی خفا ہو جاتا ہے۔ آپ ان حضرات سے تنہائی میں بات کر کے دیکھیئے۔ ان میں سے ہر ایک مولوی پر تبرا بھیجے گا اور فرقہ پرستی کو لعنت قرار دے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تاکید کر دے گا کہ "اس بات کو باہر جا کر نہ کہیئے گا۔ کون بھڑوں کے چھتے کو چھیڑے"!

بہر حال یہ ہے مسودہ دستور کا وہ حصہ جو اسلامیات سے متعلق ہے اور جس کی رو سے اس دستور کو اسلامی کہا جاتا ہے۔

دارالسلطنت زیر نظر مسودہ میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اگرچہ فیڈریشن (مرکزی حکومت) کا دارالسلطنت کسی صوبے ہی کا حصہ ہوگا، اس کا نظم و نسق براہ راست صدر مملکت کے ہاتھ میں رہے گا۔ اس ہنگامی ایجی ٹیشن سے قطع نظر، جو دارالسلطنت کے سلسلہ میں مشرقی پاکستان کے انتشار پسند طبقہ کی طرف سے اٹھائی جا رہی ہے، اس خصوصی انتظام کی ضرورت قطعاً سمجھ میں نہیں آسکی۔ اس تجویز کی رو سے (مثلاً) اہالیان کراچی اپنے نمایندے تو مغربی پاکستان کی اسمبلی میں بھیجیں گے لیکن جو قوانین یہ وہاں بیٹھ کر نافذ کریں گے ان کا اطلاق اُن کے اپنے شہر پر نہیں ہوگا۔ کس قدر تسلی بخش ہوگی یہ صورت حال! ظاہر ہے کہ یہ تجویز محض مشرقی پاکستان کے بعض عناصر کی

خوشنودی کے لئے کی گئی ہے لیکن وہ تو اس سے بھی خوش نہیں ہو سکتے۔ ان کی طرف سے مطالبہ یہ ہے کہ ڈھاکہ کو مرکز کا دارالخلافہ بنایا جائے (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) ہمیں اس پر کچھ اعتراض نہیں کہ مملکت کا دارالسلطنت کسی مقام پر ہو، لیکن وہ جہاں بھی ہو، نظم و نسق کی اس قسم کی ثنویت تو ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر اس کا نظم و نسق مرکز نے اپنے ہاتھ میں رکھنا ہے تو وہ صوبہ کا حصہ کس مقصد کے لئے ہوگا؟

زبان

یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ مملکت کی سرکاری زبانیں اردو اور بنگالی ہوں گی۔ لیکن بیس سال تک سرکاری زبان انگریزی ہی رہیگی اس کے ساتھ ہی (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اصولی ہدایت میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ مملکت کوشش کریگی کہ سارے ملک کے لئے واحد سرکاری زبان کی تخلیق اور نشو و نما کی جائے۔ ان تمام تجاویز کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

جیسا کہ ظاہر ہے یہ تجویز بھی مشرقی پاکستان کے ایک عنصر کی رضا جوئی کی خاطر کی گئی ہے ورنہ ان مرتبین میں سے کون نہیں جانتا کہ ملک میں ایک قومی زبان (اردو) پہلے سے موجود ہے اور اسی کو مملکت کی سرکاری زبان قرار پانا چاہیئے۔ لیکن وہ عنصر جس کی رضا جوئی کے لئے ایسا کیا جا رہا ہے، اس سے قطعاً مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ان کی طرف سے یہ تجویز کی جا رہی ہے کہ مملکت کی سرکاری زبان صرف بنگالی ہونی چاہیئے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں دستور کے نمایاں نکات جو اس وقت مجلس دستور ساز کے زیر غور ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس مسودہ میں کسی مفید ترمیم کی امید بھی رکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ برسر اقتدار (مخلوط) پارٹی اسے پہلے ہی اپنے ہاں پاس کر چکی ہے۔ اس لئے ان کی طرف سے اب اس میں کوئی بنیادی تبدیلی کی نہیں جائے گی۔ باقی رہے حزب مخالف کے ارکان، سو ان کا رویہ یہ ہے کہ اگر اس بل میں لکھا ہو کہ خدا ایک ہے تو وہ کہیں گے کہ یہ غلط ہے خدا دو ہونے چاہئیں۔ ایک مغربی پاکستان کا اور ایک مشرقی پاکستان کا۔ یہ بھی اسلئے نہیں کہ وہ فی الواقعہ مانتے ہیں کہ خدا دو ہیں۔ بلکہ محض اس لئے کہ اس سے (۱) موجودہ حکمران پارٹی کی مخالفت ہوگی اور (۲) مشرقی پاکستان کے باشندے (ہندو اور مسلمان) خوش ہو کر وہاں سے متحدہ محاذ کی حکومت کو توڑ دیں گے اور ان کے لئے حکومت قائم کرنے کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ اور جب وہاں متحدہ محاذ کو شکست ہوگی تو پھر مرکز کی مخلوط پارٹی بھی ٹوٹ جائے گی اور اس طرح مسٹر سہروردی کے وزیر اعظم بن جانے کے چانس پیدا ہو جائیں گے۔ آپ سوچئے کہ جب مملکت کے دستور کے مسودہ پر اس زاویۂ نگاہ سے بحث کی جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے؟ قارئین طلوع اسلام اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ طلوع اسلام جس طرح کسی مذہبی فرقہ سے متعلق نہیں اسی طرح وہ کسی پارٹی کا بھی طرفدار نہیں۔ اس کے نزدیک پارٹیوں کا وجود بھی مذہبی فرقوں کی طرح شرک ہے۔ اس طرح اس کے نزدیک پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازوؤں میں کسی قسم کی تفریق و تمیز بھی جرم عظیم ہے۔ لیکن ملک کی بدقسمتی سے اس وقت جس انداز سے حزب مخالف کا بنگالی عنصر پاکستان کی سالمیت اور استحکام کو کمزور کرنے کی مذموم کوششوں میں مصروف ہے، پاکستان کا کوئی بہی خواہ بھی اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔ ان کے پہلے نمائندہ (مسٹر ابو المنصور احمد) نے مسودہ دستور کی مخالفت میں، ایوان کے اندر جس انداز کی تقریر کی ہے، اور ایوان سے باہر ان کے مؤسس اعلیٰ بھاشانی صاحب جو زہر اگل رہے ہیں، وہ ان کی ذہنیت و عزائم کی زندہ شہادات ہیں۔ مثلاً منصور صاحب بحث تو دستور پر کر رہے ہیں لیکن شکایت یہ پیش کر رہے ہیں کہ پاکستان کی فوج میں ایک بھی بنگالی جرنیل نہیں اور مرکزی سیکرٹریٹ

میں ایک بھی سکرٹری بنگالی نہیں۔ ایسا کہتے وقت وہ قطعاً بھول جاتے ہیں کہ سول اور ملٹری کی یہ بلند ترین اسامیاں، سروسز کے ارکان سے پُر کی جاتی ہیں جو نیچے سے ترقی کرتے کرتے اوپر آتے ہیں۔ جب تقسیم کے وقت پوزیشن یہ تھی کہ ان سروسز میں بنگالی تھے ہی نہیں تو وہ آج جرنیل اور سکرٹری کس طرح سے بن جاتے؟ انہیں سروسز میں لانے کے لئے صوبائی تناسب کا ساتناہ کن اصول بھی اختیار کر لیا گیا لیکن اس کے باوجود ان کی شکایت اپنے مقام پر رہی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فوجی تربیت کے تمام سکول اور کالج ۔۔ کوئٹہ ۔۔ کاکول ۔۔ نوشہرہ ۔۔ مغربی پاکستان میں ہیں۔ غالباً ان کی تجویز یہ تھی کہ تقسیم کے بعد ان میں سے کم از کم دو شہر ادھر سے اٹھا کر ادھر منتقل کر دینے چاہئیں تھے۔ مسودہ کے اسلامی حصہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ

> اللہ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ الیوم اکملت لکم دینکم جس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے دین کو مکمل کر دیا ہے اور میں اس کا محافظ ہوں۔ سو جب اللہ خود اسلام کا محافظ ہے تو پھر یہ لوگ جو انگریزی سوٹ پہنتے ہیں جن کے چہرے پر داڑھیاں بھی نہیں جن کے سر پر ٹوپی بھی نہیں۔ یہ کیوں اسلام کی بڑ ہانک رہے ہیں..... تمہیں معلوم ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟ تم نے اپنی پلید سیاست سے اسلام کے مقدس اور مطہر نام کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ایسا مت کرو مسلمانوں کے پاس اب صرف یہی دولت رہ گئی ہے۔ اس کی تقدیس کو پلید مت کرو۔ اسلام کو اللہ اور علماء پر چھوڑ دو جو اس کے متعلق کچھ جانتے ہیں..... میں پوچھتا ہوں کہ یہ لوگ جو داڑھی مونچھ منڈے ہیں اپنے آپ کو مسلمان کس طرح سے کہتے ہیں؟ (راس کے بعد انہیں یاد آگیا کہ داڑھی مونچھ تو خیر سے ان کے اپنے چہرے پر بھی نہیں! اس لئے انہوں نے "میری طرح" کے ٹکڑہ کا اضافہ کر دیا۔)

آپ سوچئے کہ جہاں تنقید کی سطح' دلائل کا انداز' اور مخالفت کی ذہنیت یہ ہو وہاں مسودہ پر بحث و تمحیص سے کسی مفید نتیجہ کی امید کس طرح کی جا سکتی ہے؟ اور جن لوگوں کے نزدیک اسلام کا تصور یہ ہو کہ ایک داڑھی مونچھ منڈا (Clean - Shaved) اپنے آپ کو مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا' ان سے یہ توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ وہ صحیح اسلام کو سمجھ کر دستور صحیح معنوں میں اسلامی بنا سکیں گے؟

ان حالات کے پیش نظر' نیز اس حقیقت کے احساس سے کہ ملک بُری طرح سے انتشار کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ اور بھاشانی صاحب جیسے مہربان اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ بنگال، پاکستان سے الگ ہو کر ایک آزاد مملکت بن جائے گا۔ ہمارے نزدیک اب عافیت اسی میں ہے کہ اچھا بُرا دستور جیسا بھی ہے اسے جلد از جلد پاس کر کے نافذ کر دیا جائے۔ یہ مسودہ حرف آخر تو ہے نہیں جو ہمارے سر پر ابدی طور پر مسلط رہے گا۔ اس میں ترمیم کے لئے خود شق موجود ہے۔ اگر اس کے بعد آنے والی مجلس مقننہ میں بہتر دل و دماغ کے لوگ آ گئے تو وہ اس کی خامیوں کو خود دور کر لیں گے۔ نیز اس دوران میں تجربہ بھی بہت کچھ سکھا دیگا۔ اور اگر ملک میں بہتر دل و دماغ کا فقدان ہے تو پھر کسی کو کچھ شکایت ہی نہیں ہونی چاہئیے) موجودہ "بے آئینی" سے ایک ناقص دستور بہر حال بہتر ہے۔ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جب اکتوبر ۱۹۵۴ء میں محترم غلام محمد صاحب نے سابقہ مجلس دستور ساز کو برطرف کیا تھا تو اگر انہیں اس وقت عدالتی کارروائی میں نہ الجھا دیا جاتا، اور وہ خود کوئی دستور ملک کو دے جاتے تو ہم موجودہ مقام سے یقیناً ایک آدھ قدم آگے ہوتے۔ موجودہ مسودہ بھی کئی ایک نکات کی رُو سے، سابقہ مسودے سے بہتر ہے۔ اس لئے اُس اسمبلی کی جگہ اس جدید اسمبلی کا انعقاد بہر حال مفید ثابت ہوا۔ لہٰذا اب جتنی جلدی آئین کو نافذ کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

کوشش بیہودہ بہ از خفتگی۔

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

ہندوستان میں

مذہب اسلام پر نظرِ ثانی کی ضرورت

۱۹۵۳ء میں واشنگٹن (امریکہ) میں (Colloquium OF Islamic Studies) کے نام سے ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں علمائے اسلام اور مستشرقین جمع ہوئے تھے۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ اسلامی قوانین میں کس حد تک نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کانفرنس میں ترکی اور شام کے نمائندوں نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کے متعلق طلوع اسلام میں پہلے لکھا جا چکا ہے اس میں ہندوستان کے نمائندہ مسٹر آصف فیضی تھے۔ وہ خود تو شریکِ اجتماع نہیں ہو سکے تھے لیکن اس میں عنوان بالا پر ان کا مبسوط مقالہ پڑھا گیا تھا جس نے علمی اور قانونی حلقوں میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ چونکہ ہفتہ وار طلوع اسلام میں ایسے ضخیم مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہ تھی اس لیے ہم نے اسے محفوظ رکھا اب اس کا اردو ترجمہ ماہنامہ میں شائع کیا جا رہا ہے (یہ ترجمہ رحم علی ہاشمی صاحب نے کیا تھا جسے مصنف نے دیکھ لیا تھا۔ اس اعتبار سے ترجمہ کو مصنف کی طرف سے مستند سمجھنا چاہیے) اس کی اشاعت سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک میں جہاں مسلمان بستے ہیں (خواہ وہ آزاد حیثیت کے مالک ہوں یا غیر مسلم حکومت کے تابع اقلیت کی زندگی بسر کرتے ہوں) اب خیالات کا رجحان کس سمت کو ہے۔ اور زمانے کے تقاضے کیا ہیں (ویسے بھی زیرِ نظر مقالہ عمدہ معلومات کا حامل ہے)۔

طلوع اسلام کا تبصرہ مقالے کے اختتام پر سامنے آئے گا۔

ہم چاہتے تھے کہ صاحبِ مقالہ کا تعارف مختصر الفاظ میں کرا دیں کہ اتنے میں نئی دہلی سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "آئینہ" کا ۲۱ر اکتوبر ۱۹۵۵ء کا پرچہ ہمارے سامنے آ گیا جس میں فیضی صاحب کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے اس میں لکھا ہے کہ

"آصف فیضی ۱۰ر اپریل ۱۸۹۹ء کو بمبئی کے پہاڑی مقام ماتھران میں پیدا ہوئے شروع میں اپنے بزرگوں کے پاس جنجیرہ (جزیرہ) ریاست میں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی اور فقہی ذوق یہیں پیدا ہوا ہوگا۔ اس کے بعد سینٹ زیویرس ہائی اسکول اور کالج سے بی اے، ایل ایل بی کرنے کے بعد انگلینڈ بھیج دیئے گئے۔ کیمبرج اور مڈل ٹمپل میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور وہاں سے ۱۹۲۵ء میں بار ایٹ لا ہو کر لوٹے۔

اس عرصے میں انہوں نے بایولوجی (حیاتیات) اور مشرقی زبانوں کے کئی اہم انعام، اعزاز اور وظیفے حاصل کئے۔ ۱۲ برس بمبئی کے ہائی کورٹ میں بیرسٹری کی۔ لا کالج کے پرنسپل رہے۔ اور تقسیم کے فوراً بعد بمبئی کے پبلک سروس کمیشن کے ممبر چنے گئے۔ دو برس بعد مصر کے سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ شام، لبنان، اور شرق اردن میں بھی ہندوستان کے سفیر رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں واپس آئے اور تب سے یونین پبلک سروس کمیشن کے واحد مسلمان ممبر ہیں اور

اپنے فرائض میں اُن کی دیانتداری اور احساس ذمہ داری دوسروں کے لئے شان کا درجہ رکھتے ہیں۔

آصف فیضی صاحب عربی، فارسی، انگریزی، اردو زبانوں پر حاوی ہیں، جرمن اور فرانسیسی زبانیں جانتے ہیں۔ گجراتی مراٹھی بول لیتے ہیں اور نہ معلوم کون کون سی زبانیں جاننے پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ علم اُن کی بھوک ہے۔ تفکر ان کا مشغلہ ہے۔ تبادلۂ خیالات اُن کا کلچر ہے اور پھر اسی کے ساتھ مزے کی بات یہ ہے کہ کرکٹ ٹینس اور شطرنج کے خود بھی اچھے کھلاڑی ہیں اور کھلاڑیوں کے قدردان بھی۔

آصف فیضی اسلامی اور قانونی موضوعات پر پانچ کتابیں اور کوئی پچاس مضامین لکھ چکے ہیں۔ امریکہ اور یورپ میں کافی گھوم چکے ہیں، لکچر دے چکے ہیں، اور ہندوستان میں شاید تنہا شخص ہیں جو پورے یورپ... اور امریکہ کے مستشرقین سے واقفیت رکھتے ہیں۔"

یہ ہیں صاحب مقالہ، آصف بن علی اصغر فیضی۔ اب مقالہ ملاحظہ فرمایئے۔ (مقالہ کے حواشی (فٹ نوٹ) بھی خود صاحب مقالہ کے ہیں۔

"طلوع اسلام"

اسلام میں قانون اور مذہب دونوں کا منبع خدائے واحد ہے یہی درحقیقت شریعت اور فقہ کے قریبی رشتے کی بنا ہے، یعنی قانون بحیثیت قانون مطلق (یا قانون مدنی) اور قانون بحیثیت قانون اخلاقیات۔ اس لئے قانون اور مذہب کے درمیان کوئی واضح امتیاز نہیں کیا جاسکتا اور پروفیسر سنوک ہرخرونئے (Snouck Hurgronje) سے لے کر آج تک دور جدید کے علماء کا بھی یہی خیال ہے[1]۔ گو اسلامی قانون کے ان دو پہلوؤں پر تمام دور جدید کے مصنفین نے بحث کی ہے تاہم اس وقت تک اس ثنویت میں وحدت کی معنویت پر کوئی تنقیدی اور مکمل مباحثہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ البتہ جدید زاویۂ نظر پر ایک سرسری تبصرہ کی کوشش میں نے اپنے انگریزی مقالہ "لا اینڈ ریلیجن ان اسلام" (اسلام میں قانون اور مذہب) میں کی ہے۔

اب اس کی ضرورت ہے کہ شرعی اصول اور مذہب کے اس دعوے پر کہ خدا ہی ... قانون کا مصنف ہے تاریخی اور فلسفیانہ پہلو سے ناقدانہ نظر ڈالی جائے۔ اس تنقید میں اس امر کو واضح کرنا چاہیئے کہ سامی اقوام میں قانون کا منبع خاص طور پر خدا ہی کیوں سمجھا جاتا رہا۔ بعد کو اس کے کیا نتائج ہوئے۔ کس لئے اب دیگر اصول، قانون، سیاسی نظریات اور بین الاقوامی تعلقات کے ذہنی ارتقاء کے زیر اثر جدید اسلامی سوسائٹی میں مذہبی اور دنیاوی قانون کے مابین واضح امتیاز ہونا چاہیئے۔ اور کیوں اس نقطۂ نظر سے فقہ کا از سر نو جائزہ لینا ضروری ہے۔

یہ مقالہ مکمل تاریخی جائزہ نہیں ہے۔ اس میں صرف یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک ایسے مسئلہ کے بارے میں جو مدتوں سے زیر بحث ہے جدید ہندوستان کے زاویۂ نظر سے اظہار خیال کیا جائے۔ اس میں یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کے بنیادی مسائل سمجھنے کے لئے بیسویں صدی کے قانونی اور تاریخی اصول سے کام لیا جائے اور شریعت کے جدید زاویہ کے لئے ایک سرسری خاکہ تجویز کیا جائے۔

(۱)

قرون وسطیٰ میں جب شمالی ہند پر مسلمان بادشاہوں کا تسلط واقتدار تھا اس وقت کے قانون اور قانونی دستور کی مکمل تاریخ

---

[1] تفصیلی بحث کے لئے ملاحظہ ہو تفتازانی کی تاریخ (مطبوعہ قاہرہ، جلد اول۔ یہ محض فقہ کے متعلق ہے۔ شیعی فقہ کی بحث معالم الدین فی الاصول مصنفہ حسن بن زین العابدین بن احمد العاملی (مطبوعہ تہران ۱۳۱۲ھ) میں ہے۔ اس کے علاوہ زمانۂ حال میں اکثر مباحث شائع ہوئے ہیں جن کا خلاصہ میری کتاب (OUTLINES OF MOHAMMADEN) صفحہ ۱۳ میں ملے گا۔

ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ لیکن مرزا بشیر الدین احمد کی کتاب ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان میڈیول انڈیا (قرونِ وسطیٰ میں قانون کا نفاذ، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۴۱ء) میں اس کی ابتدا کی گئی ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے اپنے مذہب کے قوانین شریعت کے مطابق عدالتی نظم کے ضوابط رائج کئے۔ لیکن بہت ہی جلد یہ محسوس کیا گیا کہ ملک کی غیر مسلم رعایا پر جبراً اسلامی قانون عاید نہیں کیا جا سکتا۔ جب ہم مغلیہ دور پر آتے ہیں جو وسط ایشیا کے ترک اور حنفی المذہب تھے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ مذہب کے بارے میں زیادہ متعصب نہ تھے۔ ان بادشاہوں نے اور ہندوستان کے اکثر دیگر بادشاہوں اور لیڈروں نے مذہب کو سیاست کا آلۂ کار بنا دیا تھا۔

عام طور پر مغل بادشاہوں نے اپنی ہندو رعایا پر ہندو قانون عاید کیا اور مسلم رعایا پر اسلامی قانون۔ مسلمان بادشاہوں نے جو حنفی قاضی مقرر کئے ان کے ساتھ ہمیشہ پنڈت اور مفتی ہوتے تھے جو دھرم یا شریعت کے پیچیدہ مقدمات میں ان کی مدد کرتے تھے۔

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں رفتہ رفتہ مسلمان بادشاہوں کی جگہ پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر برطانوی حکومت نے لے لی۔ انگریز حکمرانوں نے اپنے حق میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا کہ عام طور پر جو مذہبی قوانین اور رسوم و دستور رائج تھے ان میں بہت ہی کم دخل دیا۔ (مشہور جج اور مستشرق) سر ولیم جونس نے لکھا ہے:

اس سے زیادہ صاف منصفانہ بات کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی کہ خانگی تنازعات کا تصفیہ اُن قوانین کے مطابق کیا جائے جو فریقین اپنے طرزِ عمل اور سماجی زندگی میں ہمیشہ برتتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی بڑی دانشمندی تھی کہ ایک قانون بنا کر برطانیہ عظمیٰ کی ہندو اور مسلم رعایا کو اس بات کا اطمینان دلا دیا جائے کہ جن قوانین کو وہ اپنے اپنے لئے مقدس سمجھتے ہیں اور جن کی خلاف ورزی ان کے لئے سخت ترین ظلم ہے۔ ان کی جگہ کوئی ایسا طریقہ نہ رائج کیا جائے گا جسے وہ جبر و تشدد سمجھیں[1]۔ مورلے نے اس میں یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ "ہندو یا مسلم قوانین کی تبدیلی یا تنسیخ کی مناسبت پر غور کرتے وقت، انگریزی اور دیسی اصول قوانین کی اچھائی یا برائی کے بارے میں پہلے سے جو خیالات قائم کئے گئے ہیں ان سب کو ثانوی حیثیت دینا چاہیئے۔ یہ قوانین یقیناً ملک کی کثیر التعداد آبادی کی ضروریات اور توہمات کے پیشِ نظر بالکل مناسب ہیں۔ نیز یہ اُن لوگوں کے عقائد کا جزو لاینفک ہیں، اور گو ہم پر کسی باضابطہ معاہدہ کی پابندی نہیں ہے۔ تاہم متواتر اعلانات اور قوانین سے ہم نے ان کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے[2]۔ چنانچہ انگریز حکمرانوں نے محض مغل بادشاہوں کے نقشِ قدم کی پیروی کی، لیکن قانونِ عامہ کے ضوابط کو شامل کر کے اور مساوات کے اصول کو رائج کر کے اور جدید اصول پر قانون سازی سے انہوں نے ملک کے نظامِ عدالت میں بمقابلہ سابقہ حکمرانوں کے بہت بڑی اصلاح کی۔ انگریزی دور میں ہی بتدریج حسبِ ذیل قواعد مرتب ہو گئے

(الف) یہ کہ ہر شخص پر خود اس کا مذہبی قانون عاید ہوگا: مسلمانوں کے لئے قرآن کے اور جنٹو (ہندو) کے لئے شاستر کے قوانین کی ہمیشہ پابندی کی جائے گی[3]۔

(ب) یہ کہ تمام شخصی معاملات میں ہندو یا مسلمان سے خود اس کے مخصوص، فرقہ یا ذات یا مذہب کے مطابق عمل ہوگا (مذہب جو "دین" یا مسلک سے مختلف ہے) اس کا تعلق اس قانون سے ہے کہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں یعنی سُنی اور شیعہ میں اُن کے مخصوص مذہب کے مطابق

[1] ایڈمنسٹریشن آف جسٹس ان برٹش انڈیا مصنفہ ڈبلیو ایچ مورلے (مطبوعہ لندن ۱۸۵۸ء) صفحہ ۱۹۳۔ [2] کتاب مذکور صفحہ ۱۹۶

[3] آوٹ لائنز صفحہ ۱۳۶ از مورلے صفحہ ۱۸۰ (Gantoo) جنٹو کا اینگلو انڈین لفظ جنتا یا سے نکلا ہے (رجوع آکسفورڈ ڈکشنری) اس کا استعمال ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز کے لئے کیا جاتا تھا۔ غلط ہجے کرنے میں انگریزوں کو جو ملکہ حاصل تھا اس سے بہت عجیب الفاظ بن گئے ہیں جیسے "جنٹو" = مُحمڈن مسلمان اور ڈلی "یا" دہلی سے "ڈہلی"۔

عمل ہوگا۔ مثلاً اگر کسی حنفی کا انتقال ہو تو حنفی قانون وراثت عاید ہوگا اور اگر کوئی اسماعیلی فوت ہو جو فاطمی شریعت پر عامل ہے تو "دعائم الاسلام" کا قانون برتا جائے گا۔ اسی طرح ہندوؤں میں ہر صوبہ کا نظام قانون یا قانونی تاویل جداگانہ ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کا یہ اصول کہ قاضی خود اپنے یا حکومت کے مذہب کے مطابق فیصلہ کرے گا انگریزی حکومت میں نہیں چلایا گیا۔[15]

(ج) یہ کہ اگر فریقین مختلف مذہب کے ہوں تو مدعا علیہ کے مذہب کا قانون برتا جائے گا۔ اس طرح اگر کوئی حنفی بحیثیت مدعی کے کسی اثنا عشری کے خلاف حق شفعہ کا دعوے کرے تو اثنا عشری مذہب کا قانون برتا جائے گا۔ یا اگر شوہر و زوجہ مختلف مذہب کے ہوں تو عام نتائج مدعا علیہ کے مذہب کا قانون برتنے کا ہے۔[16]

(د) یہ کہ ملکی قانون کا ارتقا بتدریج ہو، تاکہ لوگوں کے مذہبی احساسات کو کوئی سخت ٹھیس نہ لگے۔ ہندوؤں اور مغلوں میں مذہبی اعتقادات کے بارے میں رواداری برتنے کی دیرینہ روایات کے پیش نظر ہندوستان کی تمام حکومتوں نے لوگوں کے مذہبی قوانین میں بہت کم مداخلت کی اس لئے ارتقاء کی رفتار بہت سست رہی لیکن بحیثیت مجموعی نتائج تشفی بخش ہے۔

۱۹۵۰ء میں ہندوستان کے اندر جمہوری حکومت جو قائم ہوئی ہے وہ ایک غیر مذہبی ریاست ہے۔ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ ہر مذہب کو کامل مساوات کا حق ہے۔ پھر بھی مذہبی قوانین منسوخ نہیں کئے گئے اور انگریزی روایات اور دستور العمل کو بحال رکھا گیا پالیسی یہ ہے کہ جہاں تک لوگوں کی شخصی حیثیت کا تعلق ہے ان کے مذہبی قانون معقول حدود کے اندر قائم رکھے جائیں لیکن ہندو اور مسلم قوانین کی تاویل میں لفظی تشریح پر انگریزی قوانین مساوات اور سماجی انصاف کے ضوابط سے متعلق مقتضیات وقت کا رنگ غالب رہا چنانچہ ملک کے دونوں دیسی نظام قوانین پر انگریزی قانون اور اصول مساوات کا بہت زیادہ اثر ہے۔

صنعتی ترقی اور اقتصادی حالات میں تبدیلی کی وجہ سے لوگوں کی سماجی اور اقتصادی زندگی کی مناسبت سے قانون سازی میں بہت اضافہ ہوا۔ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ کی قانون سازی کی سرگرمیوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہوگا کہ اصلی کارکن طبقہ کی حالت سدھارنے اور بہتر بنانے میں ملک نے بہت تیزگامی سے کام لیا۔ ۱۹۵۲ء میں جتنے قوانین پاس ہو کر کتاب قوانین میں شامل ہوئے اُن کی طویل فہرست میں سے چند یہ ہیں: کول مائینز آرڈی ننس، ایکویزیشن آف اتھوڈبل پراپرٹی آرڈی ننس، دہلی یونیورسٹی امنڈمنٹ ایکٹ، مائنز ایکٹ، سائمنو میٹوگرافک ایکٹ، کمشنرز آف انکوائریز ایکٹ، ریزرو اینڈ آگزیلیری فورسز ایکٹ وغیرہ وغیرہ

یہ سارے قوانین جو غیر مذہبی اور زمانۂ حال کے مقتضیات پر مبنی ہیں شریعت یا دھرم کے قانونی یا اخلاقی یا روحانی معیار پر پورے نہیں اُترتے۔ یہ ہمارے موجودہ زمانے کی پیداوار ہیں جن کا ماضی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ یہ عام مذہبی قدروں سے متاثر ہیں۔ اگر اتفاقاً بعض صورتوں میں اُن کے نتائج اور شریعت کے نتائج ہم آہنگ ہیں یا بعض صورتوں میں وہ مباح کی ضمن میں آجاتے ہیں تو قانون سازی کے نقطۂ نظر سے درحقیقت اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جس بات کا لحاظ ہمارے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان جو کسی غیر مذہبی اور جدید طرز کی حکومت میں رہتا ہو اسے جدید قوانین کی پیروی کی آزادی ہونی چاہیئے، اور قانون کے نئے معیار خواہ وہ شریعت سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں

---

[15] آؤٹ لائنز صفحہ ۶۲

[16] اس قانون کی آؤٹ لائنز صفحہ ۳۰۴ میں تشریح کی گئی ہے۔

متعین کرنا چاہیئے یہ بات روز بروز زیادہ واضح ہوتی جاتی ہے کہ کوئی چیز جو قانون ہیں اچھی ہو وہ ممکن ہے کہ قوانین شریعت سے بالکل ہی الگ ہو یا جیسا کہ بظاہر عجیب بات یہ ہے کہ بعض قوانین جو غیر منصفانہ اور غیر معقول ہوں وہ بعض اوقات[21] افعال کے دائرے میں آجاتے ہوں جن کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ مثلاً ہندوستان میں حنفی قانون طلاق کے ضوابط۔

(٢)

ابھی تک ہم قطعی قانون کا ذکر کر رہا تھا یعنی وہ قانون جو عدالت کی عدالتوں میں برتا جاتا ہے لیکن اسلام میں یہ قانون مذہبی قوانین و دستور سے وابستہ ہے۔ اس لئے ہر مصنف کو عبادات و معاملات کے متعلق شریعت کی کتابوں سے مدد لینا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ جن علماء کے پاس ہم ہدایت اور روشنی کے لئے جائیں گے وہ دراصل مذہبی معلم ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ایک اسماعیلی عالم سے پوچھا کہ کیا آپ مجھے کچھ ضروری باتیں بتائیں گے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "اگر تم طالب حق ہو اور روحانی فلاح کے لئے معلومات چاہتے ہو تو بتاؤں گا اور اگر محض علمی شوق کے لئے تو نہیں" اس سے ایک نقاد محقق اور روایاتی مذہبی عالم کے نقطۂ نظر کا اختلاف واضح ہو جاتا ہے۔

ابتدائی انگریزی دور حکومت میں ہر عدالت سے پنڈت اور مفتی وابستہ ہوتے تھے۔ مفتی پورے تربیت یافتہ علماء ہوتے تھے۔ جو روایاتی علوم میں ماہر اور انہیں کے ماحول میں تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ مشہور و معروف فتاویٰ عالمگیری بادشاہ وقت کے منتخب کئے ہوئے مفتیوں نے دہلی کے گرد و نواح میں تالیف کی تھی۔ یہ شیخ نظام برہان پوری اور چار دیگر علماء کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے حکم سے گیارھویں صدی ہجری (سترھویں صدی عیسوی میں) مرتب کیا گیا تھا۔

ہندوستان کا وسیع ملک پندرھویں صدی عیسوی بلکہ اس سے بھی پہلے سے حنفی شریعت کے مدارس کا مرکز رہا ہے۔ ١٩٥٠ء کے ایک سرسری شمار میں معلوم ہوا تھا کہ جمہوریۂ ہند کے اندر ٨٨ مدارس روایاتی طرز کے تھے۔ یہ سب کے سب اہم اور قابل لحاظ نہیں ہیں۔ لیکن سب میں نصاب درس نظامیہ کا پڑھایا جاتا ہے۔ جس پر علامہ شبلی نعمانی نے اپنے خطبات میں تنقید کی ہے[22]۔ قدیم طرز کے مدرسوں کا حال مولانا ابو الحسنات ندوی نے بھی لکھا ہے[23] اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے ہندوستان کے اسلام کی تعلیم کی تاریخ لکھی ہے[24]۔ ہندوستان کے اس شاندار علم و فن کے سرمایہ کا حال مغرب کے لوگوں کو اس لئے نہیں معلوم ہے کہ بدقسمتی سے ماہرین شرعیات اردو زبان سے اب تک بے توجہی برتتے ہیں۔ اور میری ناچیز رائے میں اسلام کے موجودہ تمدن کے مطالعہ کے لئے اردو زبان بھی ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس طرح اسلام کی ابتدائی تاریخ کا سمجھنا عربی زبان کی واقفیت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی تمدنی فکر کی موجودہ رفتار کو سمجھنا اردو زبان سے واقفیت کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لئے کہ اس زبان میں مذہبی تالیفات فارسی یا ترکی سے زیادہ ہیں۔ یہ نظریہ اس وقت واضح ہو جائے گا جب آگے چل کر میں شاہ ولی اللہ، سر سید احمد خاں، شبلی، آزاد، اجمل خاں اور دیگر اصحاب کی تصنیفات کا ذکر کروں گا۔

کثیر التعداد مذہبی مدرسوں میں سب سے زیادہ اہم دیوبند کا دارالعلوم ہے[25]۔ جس میں بارہ سو طلبہ زیر تعلیم ہیں اور یہ اسی سال سے

---

[22] مطبوعہ اعظم گڑھ ١٩٣١ء صفحہ ١٤

[23] مسلمانوں کی قدیم درسگاہیں۔ مطبوعہ اعظم گڑھ ١٩٣٦ء

[24] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت مطبوعہ دہلی ١٩٤٣ء (ندوۃ المصنفین)

[25] اس کی تاریخ حال ہی میں سید محبوب رضوی نے لکھی ہے۔ تاریخ دیوبند مطبوعہ اشوک پریس دہلی۔

قائم ہے اسے بجا طور پر مشرق کا الازہر کہا جاتا ہے۔ اور اس کی علم و فن زہد و تقویٰ، سادگی اور روحانیت کی روایات کو دیکھتے ہوئے یہ تشبیہ غلط نہیں ہے۔ دار العلوم دیوبند حنفی فقہ کی درسگاہ ہے اور اسی طرح ندوۃ العلماء (لکھنؤ) جو انیسویں صدی کے متبحر عالم شبلی نعمانی کی وابستگی کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکا ہے۔ موصوف سیرۃ النبی (۵ جلدیں)[1] شعر العجم (۵ جلدیں) اور دیگر کتب و رسائل کے مصنف ہیں۔ مثلاً سیرۃ ابو حنیفہ رومی و غزالی و عمر فاروق وغیرہ

ہندوستان کے اسلامی علوم کی تاریخ بیان کرنا میرا مقصد نہیں ہے لیکن زمانہ حال تک پہنچنے کے لئے گذشتہ تین صدی کی چند نمائندہ شخصیتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ یہ شاہ ولی اللہ، سر سید احمد، خان عبید اللہ سندھی مولانا عبد الحئی اور مولانا اشرف علی تھانوی ہیں۔

(۳)

سلاطین کی حکومت دہلی میں قائم ہونے کے وقت ہی سے ہندوستان میں عربی علوم و فنون کی تعلیمی روایات برابر قائم ہیں۔ یہ روایات قدیم اور باعظمت ہیں اور بعض مقامی تبدیلیوں کے ساتھ ان تمام خصوصیات کی حامل ہیں جو اسلامی دنیا کے دیگر حصوں میں پائی جاتی ہیں۔ دیگر ممالک میں تو عربی نے مقامی زبانوں کی جگہ لے لی۔ لیکن ہندوستان میں اس مقامی زبانوں یعنی اردو، اور ہندی کو تقویت پہنچائی اور سرکاری زبان فارسی کو سہارا دیا۔

مدرسوں کی کثرت کا ایک نتیجہ خاص خاص شعبوں میں خصوصی امتیاز ہوا، اور جس طرح یورپ اور دیگر دور جدید کی یونیورسٹیوں میں ایک خاص امتیازی روایت نشو و نما پا گئی ہے۔ جیسے طالب علم آکسفورڈ ادبیات کے لئے جاتا ہے۔ کیمبرج سائنس کے لئے۔ اور پیرس یا روم یا برلن یا بازن اس لئے جاتا ہے کہ ایک مخصوص استاد کے سامنے زانوئے ادب طے کر کے اس چشمہ فیض سے سیراب ہو۔ اسی طرح ہندوستانی مدرسوں میں بھی امتیازی خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں اور خاص مدرسوں میں کافی جد و جہد کے بعد ایک خاص امتیاز کسی شعبہ علم میں پیدا ہو گیا ہے۔ رفتہ رفتہ خصوصیات کی حسب ذیل شاخیں قائم ہو گئیں۔

صرف و نحو	پنجاب میں
منطق و فلسفہ	رام پور میں
حدیث و تفسیر	دہلی میں
فقہ و اصول	لکھنؤ میں[2]

یہاں پرانے مدارس کے نصاب کے بارے میں چند باتیں کہنا ضروری ہیں۔ ہندوستان کے عربی مدرسوں میں آجکل جو نصاب رائج ہے اس پر ہندوستان کے علماء نے کافی تنقید و رد و قدح کی ہے اور اس کی ضرورت نہیں ہے کہ یہاں تفصیلات سے بحث کی جائے جو گیلانی[3] ابو الحسنات ندوی اور دیگر مصنفین کی کتابوں میں ملیں گی۔ اس سے پہلا ایک مضمون مولانا عبد الحئی لکھنوی کا ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔[4] اور پرانے نصاب کے متعدد نقادوں میں سب سے زیادہ وسیع علامہ شبلی نعمانی ہیں۔[5] اس نصاب کے نشو و نما کو پانچ دور میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ یہ پانچ دور حسب ذیل ہیں، (۱) تین سو سال ساتویں صدی ہجری تک (تیرھویں سے سولھویں صدی عیسوی تک) (۲) دسویں سے گیارھویں

---

[1] صرف پہلی جلد مولانا کی تصنیف ہے۔ بقیہ جلدیں ان کے شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے مکمل کیں جو پہلی جلد کے معیار سے بلحاظ نقد و نظر و دانش کمتر ہیں۔ سیرۃ دار المصنفین اعظم گڑھ یوپی نے شائع کی ہے اور کئی بار چھپ چکی ہے۔

[2] ابو الحسنات ندوی، کتاب مذکور صفحہ ۱۰ [3] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت مصنفہ مناظر احسن گیلانی مطبوعہ دہلی ۱۹۴۴ء [4] ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں مصنفہ ابو الحسنات ندوی مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۴۲ھ

[5] ابو الحسنات ندوی کتاب مذکور صفحہ ۹۔

صدی ہجری تک (سولہویں سے سترھویں صدی عیسوی تک) (۴) بارھویں سے تیرھویں صدی ہجری تک (اٹھارویں سے انیسویں صدی عیسوی تک) (۵) چودھویں صدی ہجری (انیسویں یا بیسویں صدی عیسوی)۱؎۔ ان پانچ ادوار میں سے اول الذکر تین کو چھوڑ کر ہم آخر الذکر دو پر نظر ڈالیں گے۔

چوتھا دور بارھویں صدی ہجری سے ملا نظام الدین کے زمانہ حیات۲؎ میں شروع ہوا۔ جو اپنے علمی تبحر کے لحاظ سے ہندوستان میں شہرۂ آفاق تھے اور ایک نصاب تعلیم مرتب کرنے پر ان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ ملا نظام الدین اپنے عہد کے فاضل ترین علماء میں سے تھے وہ ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۷ء) میں لکھنؤ کے قریب ...... ایک موضع سہالی میں پیدا ہوئے تھے ۱۱۰۵ھ (۱۶۹۳ء) میں جبکہ وہ پندرہ سال کے تھے اورنگزیب کے فرمان سے ایک مدرسہ فرنگی محل کے نام سے قائم ہوا۔ اور کچھ زمین اور مکانات ملا نظام الدین کے دو بڑے بھائیوں کے نام اس مدرسہ کے لئے وقف کئے گئے تکمیل تعلیم کے بعد ملا نظام الدین اسی مدرسہ میں معلم ہو گئے۔ اور اپنے والد ملا قطب الدین کے ساتھ مددگار مدرس رہے۔ نظام الدین کا انتقال ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں ۷۰ سال کی عمر میں ہوا۔

ملا نظام الدین عالم ہونے کے ساتھ ہی بلند اخلاق کے بھی تھے انہوں نے غربت میں زندگی بسر کی۔ امراء کے سامنے سر بلند رکھتے تھے اور غرباء سے ہمدردانہ سلوک کرتے تھے۔ ان کے صاحبزادے مشہور و معروف عبد العلی بحر العلوم بھی بڑے پایہ کے عالم تھے۔ نظام الدین کے شاگردوں نے بھی کافی شہرت حاصل کی، اور ان کی اولاد آج بھی اسی مشہور درسگاہ میں تعلیم دے رہی ہے۔ لیکن ملا نظام الدین کی لافانی شہرت اس نصاب سے منسوب ہے جو انہیں کے نام سے درس نظامیہ کہلاتا ہے۳؎۔ نصاب مختصراً حسب ذیل ہے۔

(۱)	صرف	میزان، منشعب، صرف میر، شافیہ
(۲)	نحو	نحومیر، کافیہ، شرح جامی
(۳)	منطق	صغری، کبری، ایساغوجی، تہذیب، قطبی
(۴)	فلسفہ	حکمت، میبذی، صدرہ، شمس بازغہ
(۵)	ریاضیات	خلاصۃ الحساب، اقلیدس، مقالہ اول
(۶)	بلاغت	مختصر معانی، مطول
(۷)	فقہ	شرح وقایہ، ہدایہ
(۸)	اصول	نور الانوار، تلویح
(۹)	کلام	عقائد النسفی، شرح عقاید جلالی، میر زاہد شرح مواقف
(۱۰)	تفسیر	جلالین، بیضاوی
(۱۱)	حدیث	مشکوٰۃ المصابیح

ملا نظام الدین نے جو روایات قائم کیں ان کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ گو نصاب کی کتابیں مقرر تھیں تاہم محض نصابی درس پر اکتفا نہیں کی جاتی تھی بلکہ اس سلسلہ میں وسیع معلومات بہم پہنچائی جاتی تھیں تاکہ طلبا کی آنکھیں کھل جائیں۔ ملا نظام الدین ہر مضمون کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے تھے اور محض نصاب پر قناعت نہیں کرتے تھے۔

اس نصاب کا آخری درجہ پانچواں سال ہے، اور اس سال کتابوں کی تعداد میں معقول اضافہ ہو جاتا ہے۔ منطق اور یادداشت

۱؎ خطبات شبلی نعمانی مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۱۶ اور دوسری جگہیں۔

۲؎ ابوالحسنات ندوی کی کتاب مذکور میں تفصیلات ملیں گی صفحات ۹۰ تا ۱۲۰

۳؎ مقالات شبلی نعمانی، جلد سوم، صفحات ۹۱ تا ۱۲۵، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۲ء)

گے لئے رٹنے پر زیادہ زور دیا جاتا ہے[۵۲]۔ پرانے طرز کی سب سے زیادہ وقیع تنقید شبلی نعمانی کی ہے جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی[۵۳]۔ ان کا قابل غور اعتراض یہ ہے کہ کتاب کے الفاظ، ان کے معنی، مفہوم، اور تشریح کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے اور نفسِ مضمون کے پہلوؤں پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ دینی تعلیم میں دو باتوں پر خاص طور سے توجہ دینی چاہیئے۔

(الف) محض علم کا حصول اور

(ب) وسعتِ خیال اور آزاد مطالعہ کی سہولت۔ مولانا کا ایک یہ بھی اعتراض ہے کہ عربیت یعنی عربی زبان پر عبور، معیار سے گرا ہوا ہے۔ اور یہ کہ قرآنی علوم پر کافی توجہ نہیں کی جاتی۔ خصوصاً قرآن کا انداز بیان جو اعجاز قرآن ہے اس پر بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ سب سے آخر یہ کہ عربوں نے جو علوم یونانیوں سے لئے وہ اسی شکل میں پڑھائے جاتے ہیں جیسے قرونِ وسطیٰ میں یونانیوں سے ملے تھے اور ان میں کوئی قابلِ لحاظ ترقی نہیں کی گئی۔

ان اعتراضات میں یہ بھی اضافہ ہونا چاہیئے کہ

(الف) مغربی علمائے مشرقیات کی تصنیفات سے عموماً ہمارے علماء ناواقف ہوتے ہیں اور اگر اتفاقاً ان کی تحقیقات علماء کو معلوم ہوتی ہے تو سخت مخالفت کا اظہار کرتے ہیں جو تعصب کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔

(ب) سائنس، فلسفہ، تاریخ یا تقابلِ مذاہب میں جو ترقیاں زمانۂ حال میں ہوئی ہیں اُن پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔

(ج) دیگر سامی زبانوں جیسے سریانی، عبرانی، ارامی یا حبشی زبانیں جو تحقیقی مطالعہ کے لئے لازمی ہیں اُن سے واقفیت ضروری نہیں سمجھی جاتی۔

(د) موجودہ یوروپین زبانوں جیسے انگریزی، فرانسیسی یا جرمن سے واقفیت بالکل غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ایسے مدرسوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ بیسویں صدی کے نقطۂ نظر سے بالکل ناقص ہے۔ آکسفورڈ، روما، یا شیکاگو جیسی یونیورسٹیوں میں جو دینی علوم کی سند دی جاتی ہے اُس کے مقابلے میں ان مدرسوں کی سند بالکل ہیچ ہے۔ اس لئے کہ بیسویں صدی میں جدید تاریخ، تقابلِ مذہب، منطق، نفسیات اور الٰہیات کا جو مفہوم لیا جاتا ہے اسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔

اس وقت ہم ہندوستان میں شرعی علوم کی تاریخ پر تفصیل سے بحث نہیں کرنا چاہتے ہیں لیکن گذشتہ تین صدی کی بعض نمائندہ ہستیوں کی زندگی اور کارناموں کا مختصر ذکر کریں گے جن کے نام نامی حسبِ ذیل ہیں۔ شاہ ولی اللہ، سر سید احمد خاں، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا عبدالحیؒ، اور مولانا اشرف علی تھانوی۔

شاہ ولی اللہؒ

شیخ احمد عرف شاہ ولی اللہ" ابن عبدالرحیم دہلوی ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۳ء) اور ۱۱۷۶ھ اور (۱۷۶۲ء) میں بمقام دہلی انتقال کیا۔ اس وقت سلطنت مغلیہ کا تار و پود بکھر گیا تھا اور بڑھتی ہوئی انگریزی حکومت کے دست نگر یہ کٹھ پتلی بادشاہ عیش و عشرت میں محو، اور پست اخلاق برائے نام حکمراں تھے۔ مغربی اثرات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے اسلام کے پیر اُکھڑ رہے تھے۔ اور خاص کر انگریزی عام قانون کے مقابلے میں ملکی قانون اور طریق عدالت کی کمزوری نمایاں ہو رہی تھی۔

یہ وہ نازک وقت تھا جبکہ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ مذہب اسلام کی اصلاح، اور تصوف اور شرع کے مابین عملی سمجھوتہ کرنے کی کوشش میں منہمک تھے۔ وہ حضرت فاروق اعظم خلیفہ دوم کی اولاد سے تھے۔ ان کے والد مولانا عبدالرحیم صوفی مسلک اور عالم شرع

---

۵۲ ابوالحسنات ندوی کی کتاب مذکور صفحات ۹۷ تا ۱۰۴۔

۵۳ خطبات صفحہ ۱۶۔

تھے اور فتاویٰ عالمگیری کے مصنفوں میں سے تھے۔ انہوں نے دہلی میں ایک مدرسہ رحیمیہ بھی قائم کیا۔ ولی اللہ نے سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ ۱۵ سال کی عمر میں درسیات کی تکمیل کر لی۔ اور ۱۷ سال کی عمر میں اپنے والد کے انتقال پر مدرسہ رحیمیہ کے مہتمم ہو گئے۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) اور ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) کے دوران میں وہ حج بیت اللہ کو گئے اور کچھ مدت حجاز میں قیام کیا۔ اپنی زندگی کے پُر آشوب دور میں انہوں نے دہلی میں سات بادشاہوں کا عزل و نصب دیکھا۔ وہ چار نامور لڑکوں کے باپ تھے (۱) عبدالعزیز مشہور عالم (۲) عبدالقادر فاضل اصول و فقہ (۳) شاہ رفیع الدین، اُردو میں قرآن کے سب سے پہلے مترجم اور (۴) عبدالغنی عالم و مدرس۔

شاہ ولی اللہ کثیر التصانیف تھے اور سو سے اوپر رسائل و کتب ان کے قلم سے نکلے جن میں سب سے زیادہ قابلِ لحاظ حسب ذیل ہیں۔

(۱) حجۃ اللہ البالغہ جو ان کا شاہکار ہے۔ یہ مصر کے مطبع منیرہ قاہرہ میں ۱۳۵۲ھ میں طبع ہوئی۔ اس میں مذہب کے بنیاد اور اصل روح پر جیسی کہ وہ خود سمجھے تھے سیر حاصل بحث کی ہے اور الغزالی کی احیاء سے اس کا مقابلہ غیر موزوں نہیں ہے۔ اس کا طرزِ بیان بہت ہی خوش آیند ہے اور اس میں مذہبی احکام کے اسرار و احکام بیان کئے گئے ہیں۔ جامع الازہر میں یہ اب تک داخلِ نصاب ہے۔

(۲) فتح الرحمٰن — قرآن کا فارسی ترجمہ محشّیٰ

(۳) الفوز الکبیر، فارسی — مطالعۂ حدیث کے اصول پر۔

(۴) عقد الجید، فقہ — اس میں مصنف نے یہ اصول قائم کیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ (باب الاجتہاد) بند نہیں ہوا ہے۔

(۵) التفہیمات الالٰہیہ، تصوف، عربی و فارسی۔ اس میں مصنف نے ابن العربی کے اصول وحدت الوجود اور امام ربانی احمد سرہندی کے نظریہ وحدت الشہود میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شاہ ولی اللہ ایک منفرد مجدد تھے اور انہوں نے غزالی کی طرح شریعت میں تصوف کی رنگ آمیزی کی ہے۔ انہوں نے آزادانہ تشریح و توضیح کا اصول قائم کیا اور محض تقلید کی مخالفت کی۔ وہ ایک بلند پایہ مذہبی مفکر تھے اور اُن کا زاویۂ نظر زمانۂ حال سے ہم آہنگ تھا۔ وہ اسلامی سوسائٹی کی اصلاح اور تنظیم جدید پر مسلسل مصر رہے۔

یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس زبردست عالم کے متعلق کوئی محققانہ مقالہ نہیں لکھا گیا اور متفرق مضامین شائع ہوئے جن میں فضل محمود اسیری کا مضمون[1] خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔ اُن کے فلسفہ پر فی الحال[2] فاروقی نے اپنے قابلِ تعریف مقالہ "مجدد کا نظریۂ توحید" میں بحث کی ہے۔

دوسری شخصیت جن کا ذکر ضروری ہے، سر سید احمد خاں کی ہے[3]۔ وہ انیسویں صدی کی پیداوار تھے۔ جو ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں انتقال کیا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی اور روحِ رواں تھے۔ جو مسلمان نوجوانوں کی دنیاوی تعلیم کا مرکز ہے اور اب مرکزی حکومت کی نگرانی میں تیزی کے ساتھ درجہ اول کی یونیورسٹی بن رہا ہے جس میں سائنس اور آرٹ کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ اور عربی، فارسی اور اسلامی تمدن کی تعلیم پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔

---

[1] رشتوا بہاری انظر جلد چہارم میں نے جو مضمون اس اخبار کا الگ چھپا ہوا دیکھا وہ پچاس صفحہ کا تھا اور اس پر اخبار کی تاریخ درج نہ تھی۔

[2] مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۴ء۔ نیز عبید اللہ سندھی کی دو کتابیں بھی قابلِ ذکر ہیں یعنی
(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک اور
(۲) شاہ ولی اللہ اور اُن کا فلسفہ۔
یہ دونوں اردو میں ہیں اور لاہور سے شائع ہوئی ہیں۔

[3] سر سید کی بہترین سوانح حیات الطاف حسین حالی کی حیاتِ جاوید (مطبوعہ آگرہ سنہ ۱۹۰۱ء) میں لکھی ہے جو کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ جدید نقطۂ نظر کا تبصرہ ولفریڈ اسمتھ کی کتاب "ماڈرن اسلام ان انڈیا" (مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ء) کے صفحات ۲ تا ۴۴ میں ملے گا۔ دورِ جدید کی اسلامی زندگی اور رجحانات کے مطالعہ کے لئے پروفیسر اسمتھ کی کتاب پڑھنا ضروری ہے جو دوسری بار چھپ چکی ہے۔

سرسید کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور سرکاری ملازمت سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور انگریزی یا مغربی سائنس و فلسفہ پڑھنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ گو وہ یورپین تعلیم سے مستفید نہیں ہوئے تھے تاہم انہوں نے اپنی فطری ذہانت اور عزم سے اس خیال کی کامیابی کے ساتھ اشاعت کی کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ اپنے بچوں کو زمانہ حال کے اس طریقہ پر تعلیم نہ دیں جس کی یورپ اور خاص کر انگلستان میں نشوونما ہوئی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے انہوں نے اینگلو محمڈن کالج قائم کیا جو بعد کو ترقی کر کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہو گیا۔ اور آج ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے اعتبار پسند ماہر تعلیم کی اعلیٰ قیادت میں ہندوستان کی ایک ممتاز ترین یونیورسٹی ہے۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ سرسید انگریزی تمدن سے زیادہ متاثر تھے انہوں نے انگریزوں سے تعاون تو ضرور کیا مگر صرف اس مقصد کے لئے کہ اُن کی قوم انگریزی تعلیم سے پوری طرح مستفید ہو کر ترقی کرے اس لئے کہ اسی تعلیم سے یوروپین نظر و فکر کا دروازہ کھلتا تھا اور اُن کا خیال بالکل درست تھا۔ مشہور علی گڑھ تحریک نے ہندوستان میں ترقی پذیر جدت پسند مسلمان پیدا کیا جس میں قدیم اسلامی طرز کے اخلاق کے ساتھ زمانہ حال کی معلومات کی معقول رنگ آمیزی بھی تھی۔ گذشتہ صدی کے آخری دس سال اور موجودہ صدی کے ابتدائی دور تک علی گڑھ کا "اولڈ بوائے" اس طرز کا نمونہ تھا جو انگلستان میں "وارسٹی مائنڈ" کہلاتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں، اپنے حدود کے اندر وہ ہندوستان میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مذہبیت کے بغیر چارہ نہیں ہے اور سرسید نے اس میدان میں بھی مجاہدانہ قدم رکھا۔ اُنہوں نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے نام سے جاری کیا اور جدید نظریات کو اسلام کے ساتھ سمونے کی شدومد سے حمایت کی۔ اس کے بعد انہوں نے اُردو میں قرآن کی ایک تفسیر لکھنا شروع کی جو نامکمل رہ گئی۔ تاہم اس سے اُن کا عزم، اجتہاد اور تنقیدی مہارت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ اس تفسیر نے اسلام اور اس کی مقدس کتاب پر نئی روشنی ڈالی جو انیسویں صدی کی معقول پسندی کی اسپرٹ کی بیداری سے پیدا ہوئی تھی۔ اُنہوں نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اور دیگر مباحث پر بھی مضامین لکھے۔ وہ دور جدید کے ہندوستان میں اس نظریہ کے اولین مبلغ تھے کہ اسلام کی احادیث کی کتابوں سے اعتقادات کا دائرہ تنگ نہیں کیا جا سکتا اور بالآخر ہمیں صرف قرآن ہی کو ذریعہ تحریک مان کر اُس کی طرف جانا چاہیئے لیکن اس کی تفسیر جدید سائنس اور ذہنی ارتقاء کے اصول پر ہونا چاہیئے۔

سرسید خصوصی طور پر ایک سیاسی اور سماجی محرک اور مصلح تھے لیکن انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بغیر مذہبی مجاہد کی طرح میدان میں آئے اُن کا مقصد نہیں حاصل ہو سکتا۔ یہ کام انہوں نے غیر معمولی کامیابی سے انجام دیا۔ اور وہ درحقیقت جدید اسلامی تفکر کے بانی کہے جا سکتے ہیں

اب ہم ایک ایسی شخصیت کو لیتے ہیں جو بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔ یہ عبید اللہ سندھی تھے جو شاہ ولی اللہ کی روحانی اولاد میں سے تھے اور ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۴ء میں انتقال کیا۔ پہلے وہ سکھ تھے مگر گھر سے نکل بھاگے اور سندھ میں جا کر اسلام قبول کر لیا۔ پھر مذہبی تعلیم کے لئے ۱۶ سال کی عمر میں دیوبند آئے یہاں سے وہ پھر سندھ واپس گئے اور کچھ دنوں تک درس دیتے رہے انہوں نے دور دور تک ممالک کا دورہ کیا اور افغانستان، ماسکو، ترکی (۳ سال) اور حجاز میں (۱۲ سال) رہے شاہ ولی اللہ کے وہ پُرجوش معتقدوں میں سے تھے۔ اور سیاسی لیڈر اور مفکر بھی تھے۔ سکھ گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ وحدت الوجود کے نظریہ اور ویدانت کے نظریوں کی مشابہت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستان

میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ وحدت الوجود کے نظریہ اور ویدانت کے نظریوں کی شباہت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی دوستی اور موافقت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے اور ہندو مذہب کی اچھی باتوں کا احترام کرتے تھے۔

جن اصولوں کی وہ تبلیغ کرتے تھے۔ وہ مختصراً یہ ہیں۔

(۱) ہندوستان کا ایک نسل ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بلکہ یہاں متعدد قومیں ہیں اُن سب کو آپس میں میل جول سے رہنا چاہیئے۔

(۲) جب کوئی قوم ایک محدود جغرافیائی علاقے میں رہتی ہو اور ایک زبان بولتی ہو اور ایک تمدن رکھتی ہو تو اسے ایک قوم کہہ سکتے ہیں۔

(۳) چونکہ ہندوستان میں متعدد نسلیں اور متعدد زبانیں ہیں۔ اس لئے ہر قوم کو اپنی اپنی زبان اور تمدن کو ترقی دینے کا مساوی حق ہے۔

(۴) اس ترقی کے بعد ان تمام مختلف اقوام کو مل کر ایک سیاسی وحدت بنانا چاہیئے۔ یہ وحدت جو ہندوستانی ریاست ہوگی مختلف اقوام پر مشتمل ہوگی۔

(۵) اس متحدہ ریاست کی حسب ذیل خصوصیات ہوں گی۔

(الف) سیاسی۔ یہ ایک جمہوریہ ہوگی جس میں ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق ہوگا۔

(ب) اقتصادی۔ حرفتوں کی ہمت افزائی ہونا چاہیئے۔ اور کارکنوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانا چاہیئے۔ تمام کارکن اقوام کو مساوی حقوق حاصل ہونا چاہئیں۔ زراعت کو سرکاری امداد ملنا چاہیئے۔

(ج) سماجی۔ پرانے سماجی رسوم کو بدل کر نئے طریقے اختیار کرنا چاہئیں۔

(د) مذہبی۔ تمام مذاہب کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے۔ ہندوستان کے تمام مذاہب میں مقاصد کا اتحاد موجود ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اسلام کا اصول وحدت الوجود ویدانت کے اصول سے مشابہ ہے مقصد کے اعتبار سے ہندوستان کے تمام مذاہب کو ایک ہونا چاہیئے۔ اور تفرقہ ڈالنے والے رجحانات سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

مولانا عبیداللہ سندھی ہندوستان میں بیسویں صدی کے ممتاز ترین اسلامی مفکروں اور سیاسی لیڈروں میں تھے۔ ان کی سوانح حیات اور کارنامے جامعہ ملیہ کے پروفیسر محمد سرور نے لکھے ہیں۔

شاہ ولی اللہ اور عبیداللہ سندھی اپنے عہد کے علماء کے امام تھے۔ اُن کی تحریروں سے علماء کے دور جدید کے اسکول کی بنا پڑی۔ لیکن پرانی روایات اپنی پوری قوت سے کارفرما ہیں۔ اور دُنیا پر چھائی رہیں۔

اب ہم اسی گروہ کی دو اور بڑی شخصیتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

مولانا عبدالحیٔ لکھنوی سنہ ۱۲۶۴ھ (سنہ ۱۸۴۸ء) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد عبدالحلیم سنہ ۱۲۶۰ھ (سنہ ۱۸۴۴ء) میں باندہ گئے اور پھر جونپور میں درس دیتے رہے۔ اس کے بعد وہ حیدرآباد دکن چلے گئے اور سنہ ۱۲۸۵ھ (سنہ ۱۸۶۸ء) میں انتقال کیا۔

مولانا عبدالحیٔ نے دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا اور سترہ سال کی عمر میں اپنے والد سے متداول درسیات کی تکمیل کر لی۔ سترہ سال کی عمر میں انہوں نے درس دینا شروع کر دیا۔ اور سنہ ۱۳۰۴ھ (سنہ ۱۸۸۶ء) میں ۳۹ سال کی قلیل عمر پا کر انتقال کر گئے۔ درس دینے کا سلسلہ آخر عمر تک قائم رہا۔

اُن کی تحریریں زیادہ تر درسی کتابوں کے حواشی، توضیحات اور تشریحات پر مشتمل ہیں۔ پھر بھی وہ کثیر التصانیف تھے۔ اور سو سے اوپر کتابیں اور رسالے ان کے قلم سے نکلے۔ جو مختصر عرصۂ حیات انہیں قضا و قدر سے ملا تھا اُسے دیکھتے ہوئے ان کا کارنامہ انہیں پرانے طرز کے ایک زبردست عالم کی حیثیت سے نمایاں کرتا ہے۔

انھیں عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں پر عبور کمال حاصل تھا۔

مولانا عبدالحی کا قابلِ قدر کارنامہ اُن کے فتاویٰ ہیں یہ ۴۰۲، ۵۸۶، ۷۷ اور ۱۰۰ صفحات کی تین جلدوں پر مشتمل ہیں۔ (دوسرا ایڈیشن لکھنؤ ۱۹۳۵ء) بیشتر یہ اردو میں ہیں لیکن بعض فتوے فارسی میں بھی ہیں۔ فتاویٰ عبدالحی محض اصولی اور شرعی حیثیت سے نہیں بلکہ اس لئے بھی قابلِ قدر ہے کہ اُن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمانوں کے اندر کس قسم کے سماجی تمدنی اور سیاسی مسائل اُبھر رہے تھے۔ بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ دورِ حال کا کوئی عالم جو سائنٹفک اصول سے آشنا ہو اس زبردست عالمِ دین کے رجحانات اور اصول پر ناقدانہ نظر ڈالے۔

دوسری شخصیت مولانا اشرف علی تھانوی کی ہے جو ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں پیدا ہوئے اور انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں زندگی بسر کی اور دینی تعلیم دیتے رہے جیسا کہ اس زمانہ کے علماء کا معمول تھا، انہوں نے دہلی میں قرآن حفظ کیا اور میرٹھ میں فارسی پڑھی پھر دیوبند میں مذہبی علوم کی تکمیل کر کے ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۳ء) میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کی۔ وہ بڑے پایہ کے معلم اور بااثر مقرر تھے جو لوگوں کے دلوں کو پگھلا دیتے تھے۔ انہوں نے چودہ سال تک کانپور میں شرعی علوم کا درس دیا۔ ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۳ء میں) انہوں نے مکہ معظمہ میں حاجی شاہ امداد اللہ کے روحانی اثر میں آ کر اُن سے بیعت کر لی۔

مولانا اشرف علی کا رجحان ہمیشہ صوفیانہ طریق اور مذہب کے روحانی پہلو، کی طرف رہا۔ وہ علمیت، زہد و تقویٰ اور روحانی قوتوں میں برابر ترقی کرتے رہے۔ کانپور چھوڑ کر انہوں نے اپنے وطن تھانہ بھون میں آ کر تعلیم دینا شروع کی۔

اعلیٰ علمی فضیلت اور روحانیت کے علاوہ بڑے کثیر التصانیف تھے۔ اور ۵۰۰ سے اوپر کتابیں اور رسائل اُن کے قلم سے نکلے ہیں۔ اُن کی اہم ترین تصنیفات میں ان کی تفسیر القرآن چار جلدوں میں، بیان القرآن مطبوعہ دہلی ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۱ء) اور امداد الفتاویٰ[1] ہیں۔ اُن کی تفسیر حنفی اصول پر لکھی گئی ہے۔ اور قرآن کی اردو تفسیروں میں سب سے بہتر شمار کی جاتی ہے۔ ان کی تفسیر مشکل اور پیچیدہ ہے اور مبتدیوں کے فہم سے بالاتر ہے۔ لیکن جو لوگ روایاتی درسیات پر مکمل معلومات کے خواہاں ہوں اُن کے لئے قابلِ قدر خزانہ ہے۔

اُن کے فتاویٰ سے (جو عام طور پر فتاویٰ اشرفیہ کہلاتے ہیں) اُن کی متبحر علمیت اور وسیع مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا اشرف علی نے ۸۰ سال کی عمر پوری کر کے ۱۹۴۳ء میں انتقال کیا اور سارے ملک میں اُن کا سوگ منایا گیا۔ گو وہ عقائد میں شدت پسند اور کسی حد تک رجعت پسند تھے۔ تاہم اُن کی علمیت اور زہد و اتقا کا ہر طرف شہرہ تھا۔ اور یقیناً وہ بیسویں صدی کے نصف آخر کے ممتاز ترین عالم تھے۔

(۴)

اب ہم اس سے بحث کریں گے کہ ہندوستان میں مذہبی فکر اور شرعی روایات کی موجودہ صورت کیا ہے آج کل مسلمانوں میں جو مختلف الخیال لوگ موجود ہیں ان کی تقسیم آسان نہیں ہے۔ اور راقم الحروف کو دو ایسے طبقوں کا علم ہے جو فرقی تقسیم کے کسی خانے میں نہیں رکھے جا سکتے۔ پہلی قسم تو ان اصلاح پسند مفکروں کی ہے جو کسی خاص فرقے میں شامل نہیں ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور ہے مگر اعتراضات کے تعین سے قاصر ہیں اور اپنے اعتقادات کا یقین کے ساتھ اعلان نہیں کر سکتے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو دوراہے پر کھڑے ہیں اور زیادہ غور و فکر کی خصوصیات کے حامل ہیں۔

اگر راقم الحروف سے سوال کیا جائے کہ وہ کس فرقہ سے متعلق ہے

---

[1] مطبوعہ مجتبائی پریس دہلی ۱۹۳۵ء۔ ۱۸۶ ، ۱۹۳ ، ۱۸۰ اور ۲۳۰ صفحات کی چار جلدوں میں۔

تو یقین کے ساتھ اپنی حیثیت نہ بتا سکے گا۔ لیکن وہ اتنا ضرور کہے گا کہ حقیقت کی تلاش میں وہ ہاتھ پیر مارتا ہے اور گو وہ اسلام کے عظیم روحانی ورثہ کا پورے طور پر معترف ہے۔ تاہم راسخ العقیدہ شارعین اسلام کے بنیادی عقائد کا جس شکل میں تعین کرتے ہیں اور ان کے طریق فکر اور جذبات و احساسات سے وہ قطعاً غیر مطمئن ہے۔ اسے یقین ہے کہ عقائد کا صحیح تعین اسی وقت ممکن ہوگا جبکہ پہلے کچھ انفرادی کوششیں کی جائیں جیسی کہ اس مضمون میں کی گئی ہے۔

ان قیود کے اندر موجودہ صورت حال کا خلاصہ مندرجہ ذیل شکل میں کیا جا سکتا ہے۔

(الف) راسخ العقیدہ فرقے (سُنّی اور شیعہ)

(ب) وہ طبقہ جو اقبالؔ کے خیالات سے متاثر ہے۔

(ج) جدید الخیال طبقہ جس سے میری مراد ان مسلمانوں سے ہے جو سرسید احمد خاں، شبلی اور آزاد کی روایات کے جانشین ہیں۔ ان کے ساتھ ایک چوتھا طبقہ ان کثیر التعداد تعلیم یافتہ لوگوں کا بھی ضرور شامل کرنا چاہیئے جو مذہب کی خاص جزئیات سے غیر مطمئن ہیں مگر مذہبی اصول سے غور کرنے کا نہ اُن کے پاس وقت ہے اور نہ اس کی پرواہ ہے۔

راسخ العقیدہ طبقہ پر طویل بحث کی یہاں ضرورت نہیں ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ عربی تعلیم اور مذہبی تربیت کی قدیم روایات ہندوستان میں پوری طرح برقرار ہیں۔ حنفی فرقہ کے بڑے بڑے مدارس دیوبند، فرنگی محل (لکھنؤ) ندوۃ العلماء (لکھنؤ)، سہارنپور جونپور، اور دیگر مقامات پر قائم ہیں۔ اثنا عشریوں کے بھی مدرسے ہیں جیسے لکھنؤ کا سلطان المدارس اور مدرسۃ الواعظین جہاں ابتدائی

ند مقلدین کی ایک کڑی تنقید کی مثال غلام جیلانی برق کی کتاب دو اسلام مطبوعہ لاہور ۱۹۵۰ء ہے۔

تعلیم دے کر اعلیٰ تعلیم کے لئے عراق بھیجا جاتا ہے اور واپس آکر وہ پکے مجتہد ہو جاتے ہیں۔ شافعیوں، مالکیوں یا حنبلیوں کے کوئی مدرسے نہیں ہیں داؤدی اور سلیمانی بوہروں کے چھوٹے چھوٹے مدارس۔ سورت، جزودہ حیدر آباد، اور بمبئی میں ہیں جہاں ان کے اصول مذہب کی رو جو حقائق کہلاتے ہیں، تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن عمومی حیثیت سے مذہبی کٹرپن کا ہندوستان میں زور ہے اور باوجودیکہ پاکستان کے قیام سے تعداد میں کچھ کمی ہو گئی ہے۔ تاہم حنفیوں میں (سارے ہندوستان کے اندر) اثنا عشریوں میں (بیشتر لکھنؤ میں) اور بوہروں میں (سورت، جزودہ اور بمبئی میں داؤدی اور سلیمانی دونوں کے اندر) کٹرپن کی روایات اب بھی مستحکم ہیں۔ لیکن جدید تعلیم، سوشلزم اور کمیونزم کے اثرات سے یہ تعصب کم ہو رہا ہے۔

اس کے بعد ہم پیروانِ فلسفۂ اقبال سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ اقبال کا شمار عموماً شاعروں میں ہے لیکن انہوں نے جرمنی اور انگلستان میں تعلیم پائی تھی۔ اور ہیگل، نطشے اور نیٹشے جیسے انیسویں صدی کے جرمن مفکروں کے خیالات سے بہت متاثر تھے۔ ان کے اشعار فارسی اور اُردو میں ہیں۔ انہوں نے فلسفۂ عمل کی تبلیغ کی جو جرمن اور مسلم مفکروں کی تعلیمات پر مبنی تھا۔ ان کی خصوصی حیثیت شاعر کی ہے نہ کہ باقاعدہ مفکر یا تربیت یافتہ عالم شرع کی اور اُن کے "نظام" میں بہت سی متضاد باتیں ہیں جن سے ہمیں بحث نہیں ہے۔ ہمارے مقصد کے لئے اُن کے بنیادی خیالات کی حسب ذیل تشکیل ہو سکتی ہے۔ اوّلاً انہوں نے فلسفۂ عمل کی تلقین کی اور پُرانے طرز کے صوفیوں کی بے عملی کو ناپسند کرتے تھے۔ دوئم یہ کہ وہ تصوریت کے قائل (IDEALIST) اور موحد تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ وحدت الوجود کے قائل تھے یا نہیں تاہم اُن کی تحریروں سے اور اشعار سے اس عقیدہ کی مثالیں نکالی جا سکتی ہیں۔ سوم یہ کہ انہیں

یقین تھا کہ تفسیر و توضیح کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے اور ان کی تجویز تھی کہ موجودہ قانون سازی کے طریقے کی جگہ اجماع کے اصول پر عمل ہونا چاہیئے۔ آخر ایہ کہ ان کا مرد مومن مسلمان ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایسا انسان کامل ہے جس میں سچے مسلمان کی بہترین صفات کے ساتھ جرمن فلسفیوں کے مافوق البشر کی اور صوفیوں کے عارف کی صفات بھی شامل ہوں۔

گو کہ اقبال باقاعدہ ملّا نہیں تھے۔ تاہم ہندوستان اور پاکستان میں ان کے متبعین بکثرت ہیں۔ ان لوگوں کا نقطۂ نظر فلسفیانہ یا شریعتی نہیں ہے بلکہ جذباتی اور شاعرانہ ہے۔ وہ ایک وسیع اور بلند دماغ کے شاعر تھے اور مشرق کے مسلمانوں کے تمام طبقوں میں ان کی وجہ سے اپنے دلوں کو ٹٹولنے کی تحریک پیدا ہو گئی ہے۔

افسوس کی بات ہے کہ اس بادشاہ شعر و فکر کی زندگی شاعری اور فلسفہ پر کوئی مکمل ناقدانہ مقالہ اب تک نہیں لکھا گیا حالانکہ یہ گذشتہ صدی میں دنیائے اسلام کا شاید سب سے بڑا شاعر تھا[1]۔ اقبال پر کوئی سیر حاصل مقالہ لکھنا آسان نہیں ہے۔ لکھنے والے کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں مہارت حاصل کرنا چاہیئے اور اس عہد کے ماحول کو سمجھنا چاہیئے جس میں اقبال نے زندگی بسر کی۔ پھر اسے کیمبرج کے اس دور میں جانا چاہیئے جبکہ میک ٹیگرٹ زندہ تھا۔ بعد ازاں جرمن فلسفیوں ہیگل اور فختے کی تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ نیز اسے نیٹشے کے خیالات کا ان کے اصلی روپ میں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ اسے جیلی اور ایرانی عرب صوفیوں کے تخیلات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے انسان کامل کا تخیل پیدا کیا۔ سب سے آخر میں اسے تنقیدی استعداد اور شاعری کا مذاق ہونا چاہیئے۔ اقبال کے لئے ایسا نقاد جو شاعرانہ اور فلسفیانہ دونوں ذہنیتوں کا مالک ہو اب تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ گر دنیا باسید قایم۔

عہد حاضر کے بارے میں یقین کے ساتھ لکھنا مشکل ہے لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے دو مصنفین خاص کر قابل ذکر ہیں یعنی مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر اجمل خاں۔

مولانا ابوالکلام آزاد مسلمانان ہند کے مسلمہ لیڈر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کلکتہ میں ایک نڈر اخبار نویس کی حیثیت سے شروع کی۔ اور بیسویں صدی کے اوائل میں الہلال کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد وہ تحریک خلافت میں شامل ہوئے اور اس تحریک کے روح رواں رہے۔ جب سنہ ۱۹۲۱ء میں مہاتما گاندھی میدان میں آئے تو وہ اپنی پوری قوت سے ان کے ساتھ شریک ہو گئے۔ اور دنیا کو دکھایا کہ ہندوستان کے علماء نے کس طرح ہندوؤں کے دوش بدوش ملک کی جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ پھر کچھ دنوں کی پُرشور زندگی کے بعد جس کے بیچ میں کئی بار جیل بھی جانا پڑا وہ ہندوستان کی پہلی کابینٹ کے وزیر ہو گئے۔ اور سنہ ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی کے بعد سے وہ ہندوستان کے وزیر تعلیم ہیں۔

آزاد پُرجوش مقرر، اُردو نثر کے صاحب طرز، ایک فاضل، عالم دین، اسلامی مفکر اور سیاسی لیڈر ہیں۔ اُن کے بعض ہمعصروں کا خیال ہے کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں نے اردو انشاپردازی کی

---

[1] انہوں نے اسلام میں مذہبی تخیل کی تنظیم جدید پر ایک پوری کتاب لکھ ڈالی۔ (Reconstruction Of Religious Thought In Islam) جو سنہ ۱۹۳۰ء میں لاہور میں طبع ہوئی اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس میں دوبارہ شائع ہوئی۔ یہ مذہب کے متعلق اقبال کی سب سے اہم تصنیف ہے خصوصاً ان کے آخری چھ لکچر اسلام کے دائرے میں حرکت کے اصول پر دیکھنے کے قابل ہیں۔

[2] اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہندوستان کے مصنفوں نے اس بحث پر کوئی اچھی تصنیف ہی نہیں کی بلکہ صرف یہ کہ ابھی تک کوئی سائنٹفک تبصرہ جو سیر حاصل اور ناقدانہ ہو اب تک نہیں لکھا گیا۔ ایک اچھا مختصر مقالہ خاص نوعیت کا اقبال کا تعلیمی فلسفہ ہے جو خواجہ غلام السیدین نے لکھا ہے اور حال ہی میں ایک معقول تبصرہ اردو میں ڈاکٹر یوسف حسین کا روح اقبال کے نام سے شائع ہوا ہے۔

دنیا کو بہت نقصان پہنچایا۔ راقم الحروف اس رائے سے متفق نہیں ہے ہر انسانی شخصیت مجموعۂ خصوصیات ہوتی ہے اور بعض اوقات مجموعۂ اضداد۔ کسی سادے ریاضی کے قاعدے سے اس کی خلقت کا راز نہیں معلوم ہو سکتا۔ ایسی بیش بہا، اتنی ہمہ گیر، اتنی ذہین وطباع اور ایسی عالی شخصیت کی صفات نمایاں کرنے کے لئے اعلیٰ ذہانت اور غیر معمولی سوانح نگار کی ضرورت ہے۔

اسلامی مفکر کی حیثیت سے ان کی خاص خاص تصانیف حسب ذیل ہیں۔ ان کا شاہکار شاید ترجمان القرآن ہے جو دو جلدوں میں ہے[1] تیسری جلد ابھی شائع نہیں ہوئی۔ شاید مصنف کی سیاسی مصروفیت اس کام کی تکمیل میں مانع ہے یہ کتاب قرآن کا ترجمہ بھی ہے جو برابر کے کالم میں دیا گیا ہے۔ اور تفسیر بھی ہے جس کے ساتھ تشریحی حواشی ہیں۔ یہ تفسیر انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ اس لحاظ سے بھی اردو ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے کہ اس میں خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول اور زمانۂ حال کے سائنٹیفک نقطۂ نظر کا لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اردو مذہبی لٹریچر میں ترجمان القرآن مقبول ترین کتابوں میں سے ہے اور مسلمانوں کی سوسائٹی میں اس کا گہرا اثر ہے، اگرچہ راسخ العقیدہ علماء اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

مولانا کی دیگر تصانیف میں سے بھی بعض کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ سب سے پہلے انہوں نے الہلال کے ایڈیٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی جو ایک ہفتہ وار جریدہ تھا اور کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں سیاسی اور مذہبی مسائل پر عالمانہ اور اسلامی جوش کے ساتھ حب وطن کے جذبے کو لئے ہوئے بحث کی جاتی تھی۔ ان کی کتاب تذکرہ ایک مختصر[2] سی جو پر زور مگر مشکل طرزِ انشا میں ہے۔ آخر جیل خانہ سے اُن کے خطوط "غبار خاطر"[3] عہد حاضر کے اردو لٹریچر میں اس چھوٹی سی کتاب کو جتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اتنی کسی اور کتاب کو شاید ہی ہوئی ہو۔ اس کا خوش آیند طرز ادا، شاعرانہ انداز، اس کتاب کو کلاسکی ادب کا رتبہ دیتے ہیں۔

اصول شریعت میں جدت کی تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے آزاد کا کارنامہ مختصراً یہ ہے کہ خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول پر کاربند ہیں اور مذہب و سیاست کے وسیلوں سے وہ سنی اور شیعہ کے اصول جدید سائنس دور جدید کے افکار اور گاندھیت کا فلسفہ کام میں لا کر اسلام کو بطور مذہب انسانیت کے اس شکل میں پیش کرتے ہیں جو زمانہ حال کے نوجوانوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اس طرح ملک میں وہ سب سے ممتاز مذہبی رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اندیشہ کیا جا سکتا تھا روایاتی علماء ان کی قابلیت اور خلوص کا تو اعتراف کرتے ہیں۔ مگر ان کے مذہبی نقطۂ نظر اور معقولیت کے معیار کو قبول کرنے کے لئے پورے طور پر تیار نہیں ہیں

اس عہد کے ایک اور مصنف جو عموماً مشہور عام میں نہیں ہیں مگر جو روایاتی طریقوں کے آزاد نقاد ہیں وہ پروفیسر محمد اجمل خاں ہیں جو آجکل مولانا ابو الکلام آزاد کے پرائیویٹ سیکریٹری ہیں وہ الہ آباد کے قریب ایک چھوٹے سے شہر میں ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے اور علی گڑھ میں قانون اور فلسفہ کی تعلیم اور عربی زبان سے واقفیت حاصل کر کے وہ الہ آباد یونیورسٹی میں عربی اور فارسی کے لکچرار ہو گئے اور ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۹ء تک وہاں رہے۔ گاندھی جی کی تحریک ترک موالات میں وہ ۱۹۲۰ء سے شامل ہوئے اور پنڈت نہرو اور دیگر کانگرسی لیڈروں کے

[1] جلد اوّل ۵۰۰ صفحات مطبوعہ دہلی، تاریخ طبع درج نہیں ہے لیکن مقدمہ میں تاریخ ۸ ستمبر ۱۹۳۰ء ہے۔ جلد دوم ۴۴۰ صفحات مطبوعہ بجنور اس پر بھی تاریخ طبع درج نہیں ہے۔ غالباً ۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان کوئی تاریخ ہوگی۔ جلد اوّل کا ایک نظر ثانی شدہ ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔

[3] طبع اوّل دہلی ۱۹۴۶ء بعد کو کئی ایڈیشن جائز و ناجائز شائع ہوئے۔

ساتھ کام کرتے رہے۔ یہ دوسرا رشتہ ہے جو انہیں مولانا آزاد سے وابستہ کرتا ہے۔

اُن کی خاص تین کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ترتیب نزول قرآن مطبوعہ الٰہ آباد ۱۹۳۲ء

(۲) پس منظر اسلام۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۳۶ء ۹۲، ۵۷، ۱۶۰ اور ۴۰ صفحات کے چار حصّوں میں۔

(۳) مختصر سیرت قرآنیہ مطبوعہ دہلی ۱۹۵۱ء ۲۷۲ صفحات۔

اوّل الذکر کتاب نولڈیکی اور دیگر علمائے مشرقیات کی تحقیقات پر مبنی ہے اور اس میں قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق مطالعہ کرنے کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ جب تک کہ ہر قرآنی احکام کا موقع و محل صحیح طور پر نہ معلوم ہو۔ اس وقت تک اسلام کو بحیثیت مجموعی معقولیت سے سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسری کتاب میں وسعتِ نظر اور جدید سائنٹفک زاویۂ نظر سے امور ذیل سے بحث کی ہے۔

(الف) اسلام کے قبل دنیا کی مختصر تاریخ۔

(ب) اسلام سے قبل عرب کی مختصر تاریخ۔

(ج) پیغمبر اسلام کی زندگی کا تعارف اور

(د) ان کی سوانح حیات کا مختصر خاکہ۔

تیسری کتاب پیغمبر اسلام کی سوانح زندگی کی ایک بڑی تقریباً دو ہزار صفحات کی کتاب کا (جو ابھی شائع نہیں ہوئی) خلاصہ ہے اور ہندوستان میں مذہبی افکار کی نئی رفتار کے مطابق آزاد فکر کا نمونہ ہے۔

اسلام کے بنیادی اصولوں پر عہد حاضر کے مصنفین میں اجمل خاں کی حیثیت ایک آزاد مفکر کی ہے۔ وہ قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق مطالعہ کرنے کی اہمیت پر زور دیتے ہیں، اسلام کے پس منظر پر مورخانہ انداز سے نظر ڈالتے ہیں۔ قرآن کو سمجھ کر پیغمبر اسلام کی سوانح حیات کا خاکہ بناتے ہیں اور شروع سے آخر تک وہ اپنے نقطۂ نظر میں عہد جدید کے روشن جدید سائنٹفک اصول سے محتاط ہیں اور اسلام کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے بیسویں صدی کی عام مشرقیات کی ناقدانہ صلاحیت کا اظہار کرتے ہیں۔ گو پرانے طرز کے علماء اُن کے خیالات پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ تاہم وہ عہد جدید کے افکار پر اپنا سکّہ جما کر رہیں گے۔

(۵)

اب ہم اپنے مختصر تاریخی جائزے کو ختم کر چکے۔ یہ جائزہ گو سرسری اور نامکمل ہے۔ تاہم ان عناصر کو معقولیت سے سمجھنے کے لئے جن سے ذیل کے نظریے مرتب کئے گئے ہیں۔ اس کی ضرورت تھی۔

اس بیان سے اندازہ ہو گیا ہوگا۔ کہ ہندوستان میں شریعت کی دیرینہ اور قابل احترام روایات موجود ہیں جن کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی سے ہوئی۔ اور گذشتہ چھ صدیوں سے حنفی طریقہ کی اسلامی شریعت کی۔ ہندوستان میں وسیع پیانہ پر اشاعت ہوئی۔ اور ہندوستانی علماء نے خصوصًا فن حدیث میں جو کام کیا ہے وہ کسی دوسرے اسلامی ملک کے مقابلہ میں کسی طرح کم نہیں ہے۔

قانون میں حنفی مذہب جو اس ملک میں حاوی ہے اسلامی حکومت کے ابتدائی دور ہی میں نفاذ پذیر ہو گیا تھا اور انگریزی حکومت کے دور میں اس کا سلسلہ قائم رہا۔ موجودہ جمہوری حکومت نے بھی جہاں تک لوگوں کی شخصی حیثیت کا تعلق ہے اسی کو جاری رکھا گو جدید قوانین نے اس کے حصار میں کچھ رخنے ڈالے ہیں اور آئندہ چل کر اس کی شکل بہت کچھ بدل جائے گی۔ زمانہ کی رفتار اور انسانی تجربات کے ساتھ یہ جدید اصول کہ "قانون کی نظر میں ہر شخص برابر ہے" اور "ہر شخص کے لئے ایک ہی قانون ہونا چاہیئے" یقینًا اثر انداز ہوں گے لیکن خالص قانونی نقطۂ نظر سے ہمیں حسب ذیل خصوصیات پیش نظر رکھنا چاہئیں۔ رواج کا مخفی مگر گہرا اثر، انگریزی قانون عامہ اور مساوات

کا انتشار اور قانون سازی کی سرگرمیوں کا مسلسل سیلاب۔ اس لئے ہر غیر جانبدار مبصر کو یہ صاف نظر آئے گا کہ ہندوستان کے اسلامی قوانین کے تار و پود میں شریعت پر قانون نے بھرپور حملہ کر دیا ہے اور کرتا رہیگا۔

یہاں پر مستقبل کے بارے میں ایک بات کہنا بے محل نہ ہوگا۔ راقم الحروف کو پورا یقین ہے کہ ایسے تمام انفرادی اور شخصی قوانین جو کسی قوم کی سماجی زندگی کے متعلق قدیم اصول پر مبنی ہیں رفتہ رفتہ یا تو منسوخ ہو جائیں گے اور یا ان میں اتنی تبدیلی ہو جائے گی کہ قوانین کی ایسی عام اسکیم کے ماتحت ہو جائیں جو ہر شخص پر بلا لحاظ مذہبی اختلاف کے عاید ہو۔ جرمنی قوانین، حکومتی اعمال کی مختلف شاخوں اور نیز شخصی قوانین جیسے عدالتی شادی اور طلاق میں تحریک پورا زور پکڑ چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ قوانین کی تدریجی تبدیلی، شریعت اسلام کی بنیادی حقیقت کو ضرر نہیں پہنچا سکتی ہے۔ اس مسئلہ کو صحیح طور پر بنظر تعمق دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ یہ صرف اوپر کا چھلکا ہے جو اتر رہا ہے اور اندر کا پھل یعنی اسلام کا مرکزی نقطۂ نظر اسی طرح برقرار رہ سکتا ہے کہ اس کی ہر عہد میں اور تہذیب کے ہر دور میں پھر سے تشریح و توضیح کی جائے اور موجودہ زمانہ میں ہمارا یہ کام ہے کہ اس بات کا تعین کریں کہ اسلام میں کون سے عناصر باقی رہنے والے اور کون سے تبدیلی کے قابل ہیں۔ علماء کی روایاتی شریعت موجودہ زمانے کے دماغوں کو مطمئن نہیں کرتی۔ اسلام کے اہم اصول کی از سر نو تنقیح و تشریح، و تجدید و توضیح اس عہد کی اہم ترین ضرورت ہے۔

جب ہم اسلامی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو خواہ وہ مشرق قریب یا مشرق وسطیٰ یا مشرق بعید ہیں جو ہر جگہ لوگوں کی سماجی زندگی میں چند مشترک خصوصیات ہیں ان میں اہم سیاسی کمزوری، اقتصادی غیر استواری اور روحانیت کا دیوالہ دیکھتے ہیں۔ ان میں روحانیت کا دیوالہ بنیادی سبب ہے اور اخلاقی بدحالی کا ناسور موجودہ اسلامی سوسائٹی کی شہ رگ کو کھائے جا رہا ہے۔

اس حقیقت کو زمانۂ حال کے اکثر مفکرین نے محسوس کیا ہے۔ یہاں میں عہد حاضر کے تین علماء انگریز، عرب اور امریکن کی سوچی سمجھی ہوئی رائیں پیش کروں گا جن کی سند اس خاص موضوع میں اور جن کی اسلام سے ہمدردی اور اس کی روحانی عظمت کا احترام قطعی غیر مشتبہ ہے۔

پروفیسر ایچ۔ اے آر گب اپنی کتاب موڈرن ٹرینڈز ان اسلام (اسلام میں جدید رجحانات) میں لکھتے ہیں:[1]

"چونکہ مغرب کے یا مشرق کے نقاد اسلام کو ایک فرسودہ مذہب کہتے ہیں ان کے اعتراض کو تین حقیقتوں سے شہ ملتی ہے مگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اسلام ایک زندہ اور جیتا جاگتا مذہب ہے جو لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ اور ضمیر پر حاوی ہے اور ان کے لئے دیانتدارانہ، ہوشمند، خدا ترسی کی زندگی بسر کرنے کا معیار مہیا کرتا ہے۔ دراصل اسلام فرسودہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے سخت گیر ضوابط عقید شریعت اور سماجی تاویلات فرسودہ ہیں۔ سب سے آہنگی کی جڑ یہ ہے کہ اسلام کے بیشتر تعلیم یافتہ اور ہوشمند پیروؤں میں بے اطمینانی ہے۔ اور مستقبل میں خطرہ صاف نمایاں ہے۔ جس مذہب میں لوگوں کی قوت ارادی کے تقاضے اور ذہنی رجحانات کے مابین ایک مستقل خلیج حائل ہو وہ کبھی انتشار کی قوتوں کو آخر تک روک نہیں سکتا۔ چونکہ مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے دماغوں میں انتشار کا خیال راسخ نہیں ہوا ہے اس لئے علماء جدت پسندوں کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عجلت کے ساتھ چلنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ لیکن جدت پسندی جس طرح تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے یہ اس سے ظاہر ہے کہ شریعت اسلام کی نئی تشکیل ہونا اب ضروری ہے۔

---

[1] ایچ اے آر گب ماڈرن ٹرینڈس ان اسلام (مطبوعہ شیکاگو یونیورسٹی انگلستان ۱۹۴۶ء) صفحہ ۱۲۳

پروفیسر سی سی۔ ذریق اسلامی تاریخ کے مشہور پروفیسر اور موجودہ مشرقی تمدن کے نقاد لکھتے ہیں:۔

"لیکن جب یہ (اسلام) محض چند ایسے مقررہ اصولوں کا مجموعہ رہ گیا ہے جو بلاکیف مان لئے جائیں اور ایسے قوانین اور اصول اخلاق کا ضابطہ جو سختی کے ساتھ بلا سوچے سمجھے عاید کیا جائے تو ان دوسرے مذاہب کی طرح جن کی یہی شکل ہے اسلام بھی بجائے ایک محرک کے محض ایک بوجھ بن گیا۔ اور ایک آزادی دینے والی قوت کے بجائے معطل کرنے والی آہنی زنجیر ہو گئی۔ ایسی زنجیر جو ہر سعی و ترقی میں مانع ہے[1]"

پروفیسر اے۔ ای۔ اسپیزر (آف پنسلوانیا) لکھتے ہیں:۔

"اقتصادی، سیاسی اور سماجی دائروں میں سطح پر جو کمزوری نظر آتی ہے وہ زیادہ تر اندرونی ذہنی خامیوں کی علامات ہیں۔ جب تک بنیادی خرابیوں کا علاج نہ ہو گا اس وقت تک پائیدار صحت حاصل ہونا ممکن نہیں ہے[2]"

ان حالات میں مناسب ہے کہ اس سوال پر غور کیا جائے کہ "اب کیا کرنا چاہیئے" اس سوال کا جواب آسان نہیں ہے، اور راقم الحروف کو طریقِ کار یا نتائج کے بارے میں نہ کوئی زعم ہے اور نہ قطعی تیقن۔ لیکن یہی ..... دنیا کے سوچنے والے مسلمان جس سوال میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس کا جواب دینے کے لئے کم از کوشش کر دینا ضروری ہے۔ اور شریعت کے زمانہ حال کے مطابق از سر نو تشریح کے لئے حسب ذیل مختصر اور عارضی اسکیم پیش کی جاتی ہے۔ پیشتر کے صفحات میں جو تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے

[1] دی ایسنس آف عرب سوسائٹی ٹرتھ، مڈل ایسٹ جرنل بابت ۱۹۴۹ء جلد سوم صفحہ ۱۲۶

[2] "مشرق قریب کی سماجی قوتوں میں ذہنی عنصر" مطبوعہ مڈل ایسٹ جرنل بابت ۱۹۵۳ء جلد ہفتم صفحہ ۱۴۳

کہ مجوزہ اسکیم میری طبعزاد نہیں ہے اور نہ کسی فوری خیال سے پیدا ہوئی ہے بلکہ خیالات کے متعدد دھارے جو ہندوستان میں اور باہر اس طرف بہہ رہے ہیں انہیں پر یہ مبنی ہے

اس اسکیم کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں چند بنیادی اصول ہیں اور دوسرے حصے میں ان اصول کا عملی پہلو۔

پہلا اصول
مذہب کی قانون سے علیحدگی

پہلا کام یہ ہے کہ مذہب کے اصول و معتقدات کو قانون کے اصول و ضوابط سے الگ کیا جائے۔ میرے نزدیک یہ اصول مسلمہ ہے کہ انسان کے اعتقادات کا ضروری حصہ قوانین کی اوپری پابندی سے الگ چیز ہے اور یہ کہ اخلاقی قوانین کا تعلق ضمیر سے ہے اور مطلق قانون کے ضوابط کا نفاذ صرف حکومت سے متعلق ہے۔ اخلاقی اقدار ذات سے متعلق ہیں اور قانونی ضوابط سماج سے۔ روحانیت کا اندرونی عمل اور "خدا کا تخیل" کسی حد تک سماجی طرزِ عمل کی اوپری صورتوں سے الگ ہونا چاہیئے۔ یہ امتیاز آسان نہیں ہے۔ ممکن ہے اسے غیر اسلامی بھی خیال کیا جائے لیکن اس اصول کو تسلیم کرنے کے بعد ہی کوشش شروع ہو سکتی ہے۔

اس لئے قانون کے مطابق اعمال کی نئی تقسیم ہونا چاہیئے جو قانونی شریعت کے اقدار ہمارے پاس موجود ہیں[1]۔ اس میں ایسے افعال بھی شامل کرنا چاہئیں جو شریعت کے دائرے سے باہر ہیں۔ مگر جو بعض صورتوں میں ملکی عدالتوں کے قانون کے مطابق بالکل جائز ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ترکی میں گذشت قانون کا نفاذ؛ عدالتی نکاح اور طلاق، کمپنی کا قانون، بیمہ کا قانون، ہوائی جہاز کے سفر کا قانون، قسطوں پر خریداری کے حلیہ سے

[1] الاحکام الخمسہ یعنی فرض، مستحب، مباح، مکروہ، حرام (آؤٹ لائنز)

بین الاقوامی مالی لین دین جس میں سود دینا اور لینا ہوتا ہے، سرکاری قرضے وغیرہ۔ ملکی عدالتوں اور انکم ٹیکس یا مالیہ یا حرفتی تنازعات کی مخصوص عدالتوں میں جس قانون پر عمل ہوتا ہے اس کا جس حد تک احترام کیا جاتا ہے، وہ ایک مسلمان کی نظر میں ممکن ہے کہ کچھ مختلف ہو تاہم غیر مذہبی قانون کو اصولاً قبول کرنا چاہیئے اور قبول کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا اصُول

شریعت کی از سرِ نو تنقیح

اسلام کے اصول شریعت کے تمام پہلوؤں کی از سرِ نو تنقیح ہونا چاہیئے۔ اور اس کے خاص خاص ضوابط از سرِ نو منضبط و معین کرنے کے لئے جدید فلسفۂ الٰہیات، اخلاقیات، نفسیات و منطق سے مدد لینا چاہیئے۔

اسلام کے علم الکلام پر غزالی کے عہد کے بعد سے اب تک نظرِ ثانی نہیں ہوئی ہے۔ یورپین افکار کے جدید رجحانات و تفکر کے زمانے سے اب تک پروٹسٹنٹ مفکرین نے اور سینٹ طامس ایکوئینا، دسوا میز سے لے کر مارٹین اور بیرڈیاؤ تک علمائے کلام نے جو ترقیاں کی ہیں اور یہودی اور زمانۂ حال کے دیگر مفکرین کے تخیلات ان سب کو دیکھ بھال کر اسلامی اصول کو از سرِ نو منضبط و مستحکم کرنے کے لئے کوشش کرنی چاہیئے۔

تیسرا اصُول

نظریۂ تخلیق عالم کی از سرِ نو تشریح

جہاں کہیں مذہبی کتابوں یا روایتوں میں فطرتی موجودات یا سائنٹفک مسائل کا ذکر ہو تو ان پر اعتقاد مذہبی نقطۂ نظر سے ضروری نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسے فقروں کو جدید سائنس کے اصول پر جس میں انسانیات، حیوانیات، فزکس، ریاضیات، کیمیا اور ادویات کے علوم شامل ہیں۔ جانچنے کے بعد ماننا، ترمیم کرنا یا قطعی رد کرنا چاہیئے۔

دنیا کے وجود، اور وقت اور کائنات کے تخیل کو پرنیکس کے زمانے سے اب تک بالکل بدل چکا ہے۔ اسلام کو ان تبدیلیوں کا لحاظ کرنا چاہیئے اور مذہب کے اصلی دائرہ سے سائنسی لغویات کو خارج کر دینا چاہیئے۔

چوتھا اصُول

تقابلِ مذاہب کا استعمال

تقابلِ مذاہب (Comparative religion) کا علم مذہب اسلام کے صحیح طور پر سمجھنے میں بڑی مدد دے گا۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے جدید محققین کے کارناموں سے ہمیں مذہب کی ابتدا اور تاریخ اور خدا اور روحانی دنیا کے تخیل کے نشو و نما کا سراغ بہت دور تک مل گیا ہے اس سے ناواقفیت قرآن کے مطالب کو سمجھنے میں شدید غلطیوں کا باعث ہوتی ہے۔

پانچواں اصُول

تاریخی بنیادوں کا مطالعہ

اسلام اور دیگر سامی مذاہب میں جو تاریخی ہم آہنگی ہے اس کو بغور مطالعہ کرنا اور سمجھنا چاہیئے۔ اسلام کا علم ایک خاص جغرافیائی علاقہ میں اور بعض مخصوص تاریخی حالات میں بلند ہوا اور اس کے ابتدائی پیرو سامی نسل کے تھے۔ قدیم سامیوں کے چند خاص مذہبی عقائد تھے۔ اپنے اپنے وقت پر ان میں تین مذاہب کا وجود ہوا یعنی یہودیت نصرانیت اور اسلام۔ ان تینوں مذاہب میں اسی طرح کی مشابہت ہے، جیسے ایک باپ کی تین اولادوں میں ہوتی ہے۔ یہودیت، نصرانیت اور اسلام میں …….. مشابہت کے مسائل اتنے زیادہ اور اتنے

بنیادی ہیں کہ ایک الگ سائنس یعنی "سامی مذاہب کے تقابل کی سائنس" (Comparartive Science Of semitic religion) وجود میں آسکتی ہے اسی قسم کا تاریخی اور اشتراکی نقطہ نظر ہمیں خود اپنے مذہب کی اصلی نوعیت سمجھنے کے لئے درکار ہے۔

چھٹا اصول

سامی زبانوں کا مطالعہ اور ان کی مشترک لسانیت

عربی زبان کا مطالعہ اس کی لسانیاتی مشابہتوں کے ساتھ کرنا چاہیئے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ عربی، عبرانی، ارامی، سریانی حبشی اور بعض دیگر زبانیں لسانیات کے اعتبار سے ایک ہی خاندان کی ہیں اور سامی زبانیں کہلاتی ہیں۔ اس لئے عربی زبان کی کامل مہارت کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسی خاندان کی دوسری زبانوں سے واقفیت ہو اور صرف ونحو کی اس شاخ کا پورے طور پر علم ہو جسے مغرب میں سامی زبانوں کی تقابلی گرامر (Comparative grammar of Semitic languages) کہا جاتا ہے۔ اس مضمون پر نولڈیکی، بروکلمین اور دیگر جرمن علمائے مشرقیات کی تصنیفات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ قرون وسطیٰ کے عرب لغت نویسوں نے جو غلطیاں کی ہیں ان سے ہم غلط راہ پر نہ پڑ جائیں۔ ایسی مستند کتابوں کے مطالعہ سے جیسی مثال کے طور پر آرتھر جیفری کی فارین ووکیبلری آف دی قرآن (قرآن میں بیرونی لغات) مطبوعہ بڑودہ، ہند ۱۹۳۸ء یا ایس فرینکل کی ڈی ارامیش فریمڈ ورٹرن عربیشن (عربی زبان کے سریانی عنصر) مطبوعہ بریل لیڈن ۱۸۸۶ء سے یہ ظاہر ہوگا کہ گذشتہ دو صدیوں میں یوروپین علمائے لسانیات نے کیا ترقیاں کی ہیں۔

ان آٹھوں اصول کے ماسوا ہمیں خاص خاص مضامین یا شعبے یا فقہ کے قواعد پر نظر ڈالنے کے لئے چند عملی اصول بنانے چاہئیں۔ اس بارے میں بھی میری اسکیم عارضی ہے۔ اور مزید معلومات کی روشنی میں اس پر از سر نو نظر ثانی کی ضرورت ہوگی۔

اب جو اصول ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں وہ خاص کر فقہ اسلامی کے دائرے میں جس میں اصول اور فروع دونوں شامل ہیں کارآمد ثابت ہوں گے۔

(الف) اسلام سے پہلے قانون یا رواج کیا تھا؟

مثال کے طور پر نشیلی شربات یا شادی کے مسئلہ کو لیجئے پیغمبر اسلام نے اس میں جو اصلاح کی اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے تمام موجودہ شہادتوں کو اچھی طرح جانچنا ضروری ہے۔ بعض مسلمان مصنفین کی تحریروں پر قناعت کرنا کافی نہیں ہے۔ ہمیں ماقبل اسلام کے لٹریچر، کتبات، کاغذات (منقوش پتوں پر کی تحریریں) اور عبرانی، سریانی، یونانی اور لاطینی ذرائع کی شہادتوں پر بھی غور کرنا چاہیئے۔

(ب) رسول اللہ نے اصلاح کی کوشش کس طرح کی؟

وقف۔ نماز۔ کھانے پینے کی چیزوں میں حرام وحلال کے ضوابط اور اسی طرح کے اور ضوابط کے نفاذ کا صحیح موقع ومحل معلوم کرنے سے بہت سے انکشافات ہوں گے قرآنی آیات کے صحیح معنی ترتیب نزول کے اعتبار سے اور احادیث کا مستند اور قدیم ہونا اس کی از سر نو تحقیق ہونا چاہیئے۔ قدیم علماء اور ائمہ کی سند ہر صورت میں بلا تنقیح کے نہیں مانی جاسکتی۔

(ج) اس اصلاح کے نتائج کیا تھے؟

(د) مختلف مذاہب میں اور بعد کی صدیوں میں ان قواعد کی

تعمیل وتشریح کس طرح ہوئی؟

ان دونوں پر بیک وقت غور کرنا ہوگا۔ ہر عہد کے حالات کی اچھی طرح جانچ کرنا چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ فوری نتائج کیا ہوئے اور ان ضوابط کے تاریخی نشوونما کا بھی مطالعہ کرنا چاہیئے۔ آیا بعد کی صدیوں میں ان احکام کی تعمیل کی گئی؟ کیا ان کے سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی یا ان میں ترمیم کی گئی یا ان کی شکل بگاڑ دی گئی؟ کیا یہ سیاسی یا ذاتی اغراض کے لئے استعمال کئے گئے؟

یہ چند سوالات ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر صحیح قوانین مرتب کرنا چاہیئے۔

(۵) اسلامی قانون کی موجودہ شکل کیا ہے؟ جدید قانونی مفکروں نے جو اقدار قائم کئے ہیں ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے قانون میں کونسی کمزوریاں پائی جاتی ہیں؟ سماجی انصاف کے جدید تخیل سے ہم آہنگ کرنے اور بحیثیت عام سوسائٹی کے ایک اہم جزو کے مسلمانوں کی سماجی فلاح وبہبود کو ترقی دینے کے لئے اس قانون میں کس طرح ترمیم یا اصلاح کی جاسکتی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن کا تعلق خاص کر قانون سے ہے۔

اب میں مختصراً شرعی مسائل کی ایک فہرست پیش کروں گا جن پر متذکرہ اصول اولین کے ماتحت نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ یہ فہرست محض عارضی ہے اور اس میں وقتاً فوقتاً ترمیم کرنا اور نظر ثانی کرنا پڑیگا۔

۱۔ خدا کے وجود کا تخیل، اس کی نوعیت اور تاریخی ارتقا۔

۲۔ یہ مذہبی عقیدہ کہ قرآن خدا کا کلام (یونانی لوگاس Logos) ہے۔

۳۔ انسانی روح کی نوعیت اور لافنائیت۔

۴۔ وحی کی نوعیت اور الہام سے اس کا امتیاز۔

۵۔ مسئلہ اعجاز القرآن۔ زبانی اور نفسیاتی الہام کی نوعیت

۶۔ قرآن کا نظریہ تخلیق عالم۔

۷۔ قرآن کی تفسیر کے اصول (لسانیاتی)

۸۔ محکم اور متشابہ آیات کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

۹۔ قرآنی آیات کے نزول کی ترتیب۔

۱۰۔ قرآن کے اخلاقیات۔ سامی اقوام میں اخلاقی حالات کی ابتدا اور نشوونما کی تاریخ۔

۱۱۔ قرآن میں جن عبادات کا ذکر ہے ان کی نوعیت اور بنیاد۔

۱۲۔ متن کی تنقید کے اصول۔

۱۳۔ قرآن پاک کی جدید اصول پر تنقید۔

اسی طرح ہمیں یہ تحقیق کرنا چاہیئے کہ قانون کا منبع کیا ہے؟ اور حدیث کی "بلند تر تنقید" (Higher criticism) کا جو اجماع کی تاریخ اور اجتہاد، تقلید کی تعلیم کس طرح شروع ہوئی، اس تعلیم کی تاریخی نشوونما اسلام کے ابتدائی دور کے فلسفیانہ تخیلات یونانی، رومن، زرتشتی اور دیگر وسائل سے کیا کیا اخذ کیا گیا۔ ہر فلسفی نے ذاتی طور پر کیا دیا۔ قدیم نظام فلسفہ میں کتنا حصہ اب بھی کارآمد ہے۔

اب اس بے ترتیب اور نامکمل فہرست کو ختم کرنا چاہیئے۔ اس راستہ پر جس کی انتہا نہیں ہے آگے بڑھنا مشکل ہے لیکن عارضی تجاویز محض عارضی ہونے کا دعوے کرسکتی ہیں۔ جن کی مزید تحقیقات کی روشنی میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔

اگر شریعت کے پورے ڈھانچے کو اس نقادانہ نظر سے جانچا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ مذہب کے روایتی اور مستحکم خاکے کے علاوہ نئی شکلیں پیدا ہوں گی۔ جو شاید ایک ملک میں دوسرے ملک سے بالکل مختلف ہوں اور ان میں نقائص اور خامیاں بھی

ہوں گی، لیکن رفتہ رفتہ ضوابط کی ایک مستقل اور سمجھی بوجھی شکل پیدا ہوگی جو اسلام کی از سر نو تشریح کی بنیاد ہوگی۔ اس طرح کی نئی تشریح ان کثیر التعداد لوگوں کی تسکین و تقویت کا باعث ہوگی جن کا اعتقاد اسلام کے پرانے ڈھانچے پر نہیں رہا ہے لیکن اسلام کی اصلی روح پر ان کا عقیدہ مستحکم اور راسخ ہو جائے گا۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم

مقالہ آپ نے دیکھ لیا۔ اسی ضمن میں، جریدہ آئینہ کے نامہ نگار نے فیضی صاحب سے انٹرویو کیا تھا جس میں ان سے چند ایک سوالات پوچھے گئے تھے۔ چونکہ وہ سوال اور ان کے جواب، موضوع زیر نظر کی مزید وضاحت کرتے ہیں، اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ انہیں بھی یہاں نقل کر دیا جائے۔

سوال:۔ آپ نے اپنے کتابچے کا نام رکھا ہے "ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت"۔ تو کیا آپ اسلامی ارکان، اصول اور عقاید میں کوئی بنیادی ترمیم چاہتے ہیں؟

جواب:۔ جی نہیں۔ بنیادی ترمیم کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس بات کو مسلمہ اصولی سمجھتا ہوں کہ اعتقادات اور اصول کی بنیاد امر ہے۔ اوپر کی تعمیر اور چیز ہے۔ بنیاد برقرار رہتی ہے۔ اوپر کی تعمیر وقتاً ضرورت اور ماحول و حالات کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ یہ اوپر کی تعمیر دراصل روزمرہ کی سماجی زندگی کے قوانین ہیں جو کبھی رسم و رواج کی حیثیت سے اور کبھی سرکاری قانون کی رو سے قائم ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اصرار نہ کرنا چاہیئے کہ ہمارے یہاں بھی قانونی ضوابط وہی برقرار رہیں جو اب سے صدیوں پہلے جب سماج کچھ اور تھا، پائے جاتے تھے۔ کیونکہ اخلاقی قدریں انسان کی اپنی ذات سے متعلق ہیں اور قانونی ضوابط پورے سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذاتی طور پر میں مسلمان ہوں، موحد ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں۔ روزہ رکھتا ہوں۔ زکوٰۃ دیتا ہوں۔ حج کرتا ہوں۔ قیامت پر یقین رکھتا ہوں یا نہیں رکھتا ہوں۔ ــــ یہ میرا ذاتی فعل ہے لیکن زندگی کے بیرونی قوانین میں ہندوستان کی بدلتی ہوئی صورت حال کو اور اس کے تقاضوں کو حقیقت سمجھتے ہوئے میں اپنے قوانین میں تبدیلی کر لیتا ہوں۔ اس سے میرے اعتقادی اور ذاتی اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔

سوال:۔ آپ نے اپنے دوسرے مقالے (LAW AND RELIGION IN ISLAM) کے صفحہ ۳۶ پر یہ الفاظ لکھے ہیں "مسلمانوں کا بنیادی اعتقاد اس فارمولے میں پایا جاتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ (خدا صرف ایک ہے۔ محمد اس کے رسول ہیں۔ قرآن خدا کا کلام ہے یعنی براہ راست احکام۔ اور رسول کا عمل بالواسطہ احکام ہیں۔ اس لئے ان پر غور و فکر اور چھان بین ضروری ہے (یہ دونوں ذریعے منقول ہیں) جو صرف توفیق خداوندی سے ہی انسانی علم میں آسکتے ہیں۔ انسانی ذہن اس پر قانونی ڈھانچہ تیار کرتا ہے (جسے ہم معقول کہتے ہیں) جب حالات کی ترتیب بدلتی ہے اور نئی صورت حال سامنے آتی ہے تو مسلمان سوچتا ہے کہ کیا پہلے کے اصول اس نئی صورت حال پر منطبق نہیں کئے جا سکتے؟ کبھی اس کوشش میں ایسا ہوتا ہے کہ اتفاق رائے ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ اتفاق رائے ہو گیا تو اجماع ہے، ورنہ قیاس۔ لیکن اسی کے ساتھ مستقل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور نئے تقاضے پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کا نیا حل چاہیئے۔ چنانچہ "یہ ایک حقیقت ہے

کہ قانون کی دفعات حالات و زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مختلف ہوجاتی ہیں۔" (مجلہ ۔ دفعہ ۳۹) قانون اور مذہب دونوں کا ذریعہ چونکہ ایک ہے اس لئے ان کا باہم ہونا بھی ممکن ہے ۔ سوسائٹی کے بدلتے ہوئے حالات کو، تاریخ کے سبق کو، تمدن کے نت نئے سانچے کو، اور موجودہ دنیا کے اقتصادی ڈھانچے میں ارتقار کا سلسلۂ عمل ہے اس کو کافی طور پر شریعت نے پیش نظر نہیں رکھا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ کم و بیش دنیا کے بہت سے ملکوں میں "اسلامی قانون" پیچھے رہ گیا اور پست حالت میں نظر آتا ہے ۔"

سوال :۔ ہم اگر آپ کی رائے سے اتفاق کریں تو آپ کے پاس کیا تجویزیں ہیں جن سے یہ پس ماندگی دور کی جا سکے اور اسلامی قانون کو دوسرے ۔ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کے قانون کو ترقی یافتہ، دنیا کے عام قوانین کی سطح پر لایا جا سکے ۔

جواب :۔ میں کوئی تفصیل نہیں دے سکتا۔ البتہ ایک مختصر خاکہ پیش کرتا ہوں جس پر مسلمانوں کے ارباب رائے اگر غور کریں تو کسی نتیجے پر پہنچنے کی راہ نکل سکتی ہے ۔ یہ مختصر خاکہ یا عارضی اسکیم کوئی میں نے آپ سے تیار نہیں کرلی ہے بلکہ "خیالات کے متعدد دھارے" جو ہندوستان کے اندر اور باہر بہہ رہے ہیں اور خود ہمارے ملک میں اب تک تجدید الشریعۃ (شریعت کی ترتیب نو) کے لئے جو کوششیں گذشتہ کئی صدیوں میں ہوئی ہیں ان کی روشنی میں یہ بحث طالب خاکہ ہیں۔ نے تیار کیا ہے کہ : جس کے اہم نکتے یہ ہیں : (۱) دنیاوی قانون اور مذہبی اعتقاد کو ایک دوسرے سے الگ کیا جائے اور غیر مذہبی قانون کو بھی قابل قبول سمجھنا چاہیئے۔

اسلامی روحانیت اور اس کا پیغام ایک مستقل چیز ہے اور مستقل ہونے کا مفہوم یہ کہ وہ جامد نہیں بلکہ متحرک ہے پہلے دوسرے مذاہب کس عالم میں تھے اور ان پر اب تک کیا کیا تحقیقات ہوئی ہیں، اس کو سامنے رکھ کر قرآن کا مطالعہ اور اس کی تشریح کی جائے۔

(۲) تاریخی بنیادوں کی روشنی میں اسلام کے بدلتے ہوئے حالات کو سمجھا جائے اور یہ تحقیق کیا جائے کہ دنیا میں مسلمانوں کی معاشی اقتصادی اور سماجی پستی کے اسباب میں اسلامی قانون کے جامد اور غیر متحرک تصور کو کس قدر دخل ہے اور اسے کیونکر متحرک بنایا جائے۔

سوال :۔ کیا آپ جماعت اسلامی سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوں گے۔ اگر وہ کہیں کہ مومن افراد کے ذریعے اسلامی سوسائٹی پہلے تعمیر ہونی چاہیئے پھر اسلامی قانون خود بخود معقول اور سارے مسائل کا حل بن جائے گا

جواب :۔ جی نہیں۔ آج کی دنیا میں سوسائٹی ملکی بنیادوں پر قائم ہے۔ اسلامی سوسائٹی دنیا کے کسی حصے میں قائم کی جا سکتی ہے میری سمجھ سے باہر ہے۔ بہر حال ہو جائے تو کیجئے ورنہ اس تجویز کو نہ مانئے ۔ اگر ترمیم و اصلاح کے تقاضے کو نہ سنا گیا تو دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے شرمائیں گے ۔ اور مذہب اسلام محض ایک رسمی چیز ہو کر رہ جائے گا۔

طلوع اسلام

سب سے پہلے اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس مقالہ کا جو حصہ تاریخی ہے یا جس میں دوسروں کے معتقدات و تصورات کا ذکر کیا گیا ہے، ہم اس پر کوئی تنقید نہیں کر رہے ہیں۔ (حالانکہ اس میں کئی باتیں ایسی ہیں جن پر تنقید کی جا سکے)۔ ہم اس کے صرف اس حصہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں جس کا تعلق اس موضوع سے ہے کہ مسلمانوں میں

قوانینِ شریعت پر نظرِ ثانی کی ضرورت کس حد تک ہے۔

۲۔۔۔ یہ مقالہ پڑھنے والے کے دل پر جو سب سے پہلا اثر چھوڑ جاتا ہے، اسے ضیق یا گھٹن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ فیضی صاحب کا شمار ہندوستان کے بلند پایہ (جدید) علمی طبقہ میں ہوتا ہے۔ منصب اور وجاہت کے اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ وہ ہندوستان کے پبلک سروس کمیشن کے رکن ہیں۔ یہ مقالہ ہندوستان سے بہت دور، امریکہ کے ایک علمی اجتماع کے لئے لکھا گیا تھا۔ بایں ہمہ، آپ محسوس کریں گے کہ صاحبِ مقالہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے کھلے کھلے الفاظ میں نہیں کہہ رہے۔ اسی کو ہم نے ضیق اور گھٹن سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اثر ہے ہندوستان کی اس فضا کا جس میں وہاں کا مسلمان جینے پر مجبور ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انگریز کی حکومت میں بھی ایک دباؤ تھا، لیکن وہ اس قسم کا حریت کُش اور گلوگیر نہیں تھا۔ کتنا بڑا ہے مسلمانانِ پاکستان پر اللہ کا احسان کہ وہ ہندوؤں جیسی قوم کی غلامی سے آزاد ہو گئے ـــــ اور کتنا بڑا احسان فراموش ہے پاکستان کا مسلمان جس نے اس نعمتِ عظمیٰ کی کچھ بھی قدر نہیں کی۔

۳۔۔۔ فیضی صاحب جو بات سب سے پہلے کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ ہونا چاہیئے۔ یہ وہ دعوت ہے جو مسٹر فیضی کی طرف ہی سے نہیں دی جا رہی بلکہ اس میں وہاں کے بڑے بڑے "مولانا" بھی شامل ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب اور جہاں مسلمانوں کو غیر مسلموں کی حکومت کی زندگی بسر کرنا ہو، وہاں ان کے لئے اس مسلک کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ مذہب کو شخصی اعمال اور انفرادی اخلاق کے دائرہ تک محدود رکھیں اور معاملاتِ دنیا میں ملک کے عام قانون کی اطاعت کریں۔ لیکن اگر ان حضرات میں جرأت ہو تو وہ اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جن حالات میں ہم رہنے پر مجبور ہیں ان میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ مذہب کو سیاست سے الگ رکھا جائے۔ ہماری یہ زندگی اسلامی نہیں کہلائی جا سکتی۔ نہ ہی اسلام کو اس معیار پر پرکھنا چاہیئے۔ اگر یہ حضرات اتنا کہہ دیا کریں تو وہاں کا مسلمان اس فریبِ نفس میں تو نہ رہے کہ ہم غیر مسلموں کے تابع رہتے ہوئے بھی اسلامی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ انہیں اس کا احساس رہے کہ ہماری موجودہ زندگی غیر اسلامی ہے۔ اور اسلامی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کی سیاست بھی دین ہی پر مبنی ہو۔ اگر ان کے دل میں یہ احساس زندہ رہے تو اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دن آزادی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ ورنہ اس قسم کے جھوٹے فریب کا نظری نتیجہ یہ ہو گا کہ ہندوستان کا مسلمان ایک آدھ نسل کے بعد، یا تو ہندوؤں میں مدغم ہو جائے گا اور یا شودر بن کر رہ جائے گا۔ اس لئے کہ جب مذہب کو سیاست سے الگ کر لیا جائے تو مذہب، پوجا پاٹ کی رسوم اور چند اخلاقی نصائح سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتا۔ اور یہ بقول ابوالکلام صاحب آزاد "ایسی عالمگیر سچائیاں ہیں جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں"۔ سو جب ہندومت میں بھی وہی سچائیاں ہوں جو اسلام میں ہیں، تو پھر مسلمانوں کی مت ماری ہوئی ہے کہ مسلمان رہ کر خواہ مخواہ وہ تمام مصیبتیں مول لی جائیں جو وہاں حاکم قوم کے ہاتھوں آئے دن روا رکھی جاتی ہیں۔ انگریز کی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان کے صاحبِ فکر و نظر اور اربابِ قلب و جگر مسلم رہنماؤں نے اپنی قوم کے دل میں اس احساس کو بیدار کیا تھا کہ غیر مسلموں کی حکومت میں رہتے ہوئے ہم کبھی اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس کا نتیجہ آزادی کی طلب اور اپنی جداگانہ حکومت کا تقاضا تھا۔ ہندوستان میں آج اس قسم کے مسلمان راہ نماؤں کا فقدان بڑا تاسف انگیز اور جگر خراش ہے، اور تو اور، جو جماعت اسلامی پاکستان میں یہ کہہ رہی ہے کہ

اقامتِ دین کی ہر کوشش بیکار ہے۔ جب تک حکومت کی مسندیں ان کے قبضہ میں نہ آجائیں، وہی جماعتِ اسلامی ہندوستان میں یہ کہتی ہے کہ ہم ایک مذہبی جماعت ہیں جسے سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ کسی قوم میں اربابِ جرأت کا اس طرح ختم ہو جانا بڑا ہی عبرتناک ہے۔

۴ —— ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں کا یہی رطیرہ رہا تو کچھ عرصہ کے بعد وہاں مسلمان اپنا جداگانہ ملی تشخص کھو بیٹھیں گے۔ اس کی شہادت فیضی صاحب کے بیان سے بھی مل جاتی ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ

> یہاں مستقبل کے بارے میں ایک بات کہنا بے محل نہیں ہوگا۔ راقم الحروف کو پورا یقین ہے کہ ایسے تمام انفرادی اور شخصی قوانین جو کسی قوم کی سماجی زندگی کے متعلق قدیم اصول پر مبنی ہیں، رفتہ رفتہ یا تو منسوخ ہو جائیں گے اور یا ان میں اتنی تبدیلی ہو جائے گی کہ قوانین کی ایک ایسی عام اسکیم کے تحت ہو جائیں جو ہر شخص پر بلا لحاظ مذہبی اختلاف کے عائد ہوں۔

فیضی صاحب کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اس وقت ہوا کا رُخ کس طرف کو ہے؟ وہاں یہ کوشش ہو رہی ہے کہ شخصی زندگی کے متعلق بھی ایسے قوانین وضع کئے جائیں جو ہر شخص پر بلا اختلافِ مذہب یکساں طور پر عاید ہوں۔ مثلاً نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ملکی قوانین کا اطلاق، وہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو۔ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی یہ کوشش محض اس لئے ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا جداگانہ ملی تشخص باقی نہ رہے لہٰذا اگر فیضی صاحب یا ان کے ہم نوا، ہندوؤں کے اس مقصد سے متفق ہیں تو انہیں کھلے بندوں اس کا اعتراف کرنا چاہیئے۔

لیکن اگر وہ چاہتے ہیں کہ وہاں مسلمان ایک منفرد ملی حیثیت سے باقی رہیں تو انہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ قوموں کی جداگانہ شخصیت ان کے جداگانہ قوانین و مسالک سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک میں اس امتیاز کو ختم کر دیا جائے تو وہاں مختلف قوموں کا امتیاز بھی ختم ہو جایا کرتا ہے۔ انگریزوں کے زمانہ میں ہندوستان میں مسلمان ایک جداگانہ ملی حیثیت سے اس لئے باقی رہ گئے تھے کہ انہوں نے (کم از کم) اُن کے پرسنل لاء کو ان کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ لیکن اب ہندو اس امتیاز کو بھی مٹانا چاہتا ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو گوارا نہیں کر سکتا۔ ہندو کی یہ چال بڑی گہری اور خطرناک ہے اور ہم ہندوستان کے مسلم اربابِ فکر سے پُر زور درخواست کریں گے کہ اگر وہ بحالاتِ موجودہ مذہب اور سیاست کو اکٹھا نہیں رکھ سکتے تو کم از کم اپنے مذہبی پرسنل لاء کا تحفظ تو ضرور کریں۔ اور فیضی صاحب کی طرح اس دھوکے میں نہ آجائیں کہ

> قوانین کی یہ بتدریج تبدیلی شریعتِ اسلام کی بنیادی حقیقت کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

جب قوانین کی اس قسم کی تبدیلی سے مسلمانوں کا جداگانہ ملی تشخص ہی باقی نہ رہا تو وہاں شریعتِ اسلام کیسے باقی رہ سکے گی؟ اور جو قوانین اصلِ شریعت پر مبنی ہیں، ان کے تبدیل ہو جانے سے اصلِ شریعت کس طرح محفوظ رہے گی؟ مثلاً یہ حکم کہ کسی مسلمان (مرد یا عورت) کی شادی کسی مشرک سے نہیں ہو سکتی؛ اصلِ شریعت پر مبنی ہے۔ اگر اس حکم میں تبدیلی کر دی جائے گی تو اصلِ شریعت کس طرح غیر متأثر رہے گی؟

۵ —— فیضی صاحب کی جس تجویز سے ہم متفق ہیں اور جس کے متعلق ہم چاہتے تھے کہ وہ اسے اور زیادہ وضاحت سے پیش کرتے یہ ہے کہ

موجودہ زمانہ میں ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس بات کا تعین کریں کہ اسلام میں کونسے عناصر باقی رہنے والے اور کون سے تبدیلی کے قابل ہیں۔ علماء کی روایاتی شریعت موجودہ زمانہ کے دماغوں کو مطمئن نہیں کرتی ...... دراصل اسلام فرسودہ نہیں ہے بلکہ سخت گیر ضوابط، مقیدِ شریعت، اور سماجی تاویلات فرسودہ ہیں۔

یہ ہے اصل کرنے کا کام اور اس کے نہ کرنے سے وہ بے اطمینانی بڑھتی جارہی ہے جو آگے جاکر لامذہبیت پر منتج ہو جاتی ہے۔ اربابِ شریعت کا اصرار ہے کہ شریعت کے وہ جزئی احکام بھی جو کسی خاص زمانہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے، وحیٔ منزل کی طرح غیر متبدل ہیں۔ دوسری طرف جب ہماری نئی پود دیکھتی ہے کہ جزئی قوانینِ شریعت (جنہیں غیر متبدل قرار دیا جارہا ہے) زمانہ کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتے تو وہ خود اسلام کے متعلق یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ فرسودہ ہو چکا ہے اور اس قابل ہے کہ اسے تیاگ کر اپنے معاملات خالص عقل کی رُو سے طے کئے جائیں۔ حقیقت اور صداقت نہ اُن کے ساتھ ہے نہ اِن کے۔ اسلام غیر متبدل اور قابلِ تغیر و تبدل، دونوں کے امتزاج کا نام ہے۔ غیر متبدل ہیں وہ احکام و اصول جو قرآن کے اندر ہیں۔ اور قابلِ تغیر و تبدل ہیں وہ جزئی احکامِ شریعت جو قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، مختلف زمانوں کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ اس وقت کم و بیش مسلمانوں کے تمام ممالک میں ایک اضطرابی اور ہیجانی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ قوانینِ شریعت عصرِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ اور مسلمانوں کی ترقی کے راستے میں حائل ہیں۔ لیکن چونکہ انہیں بتایا جاتا ہے کہ وہ ان قوانین کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے اس لئے وہ حیران ہیں کہ اس "گجدار و مریز" کا علاج کیا ہے؟ واشنگٹن کی کانفرنس میں فیضی کی تقریریں ہوئیں وہ اسی حیرت و اضطراب کا آئینہ دار تھیں۔

لہٰذا عصرِ حاضر کے مفکرین کا کام یہ ہے کہ وہ

(۱) پہلے یہ دیکھیں کہ قرآن کے غیر متبدل اصول کون کون سے ہیں، اور اُن کی روشنی میں وضع شدہ، شریعت کے جزئی قوانین کون کون سے۔

(۲) پھر ان جزئی قوانین کو اپنے زمانے کی ضروریات کی روشنی میں پرکھیں اور دیکھیں کہ ان میں کون کون سے ایسے ہیں جنہیں علی حالہٖ رکھا جا سکتا ہے اور کون کون سے ایسے جو کسی تبدیلی کے متقاضی ہیں۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہو، ان میں، قرآن کے اصولوں کی روشنی میں ضروری تبدیلی کر دی جائے۔ جو یکسر ناقابلِ عمل ہو چکے ہوں انہیں منسوخ کر دیا جائے۔ اور جہاں پہلے سے وضع شدہ کوئی قانون موجود نہ ہو، انہی اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے نیا قانون وضع کریں۔ یہی اسلام کا منشاء تھا اور اس کے مطابق قانون سازی سے ہم اس منشاء کو پورا کر سکتے ہیں۔

۲۔ فیضی صاحب نے اپنے مقالہ کے اخیر میں لکھا ہے کہ "اب میں مختصراً شرعی مسائل کی ایک فہرست پیش کروں گا جن پر متذکرہ اصولِ اولین کے ماتحت۔ نظرِ ثانی کی ضرورت ہے" لیکن اس کے بعد انہوں نے جو فہرست پیش کی ہے اس کا تعلق شرعی مسائل سے نہیں بلکہ عقائد سے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسائل کی طرح، مسلمانوں کے موجودہ (مروجہ) عقائد پر بھی نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ لیکن "آزادانہ" نظرِ ثانی کی نہیں بلکہ اُن عقائد کے سرچشمۂ اصلی یعنی قرآن کریم کی روشنی میں نظرِ ثانی کی۔

لیکن فیضی صاحب کی عقائد کی فہرست میں بھی ایسی باتیں شامل ہیں جن پر "نظرِ ثانی" کی ضرورت ایک مسلمان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ مثلاً قرآن کریم کے متن کی تنقید کے اصول"

یا، قرآن پاک کی جدید اصول پر تنقید۔ کیا فیضی صاحب کے نزدیک قرآن کا متن (TEXT) بھی یقینی نہیں جس کے لئے انہیں نظرثانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے؟ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس تصور کو اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ قرآن کا دعویٰ ہے اور اس پر ہر مسلمان کا ایمان کہ قرآن کا ایک ایک لفظ محفوظ ہے اور اس کے متن کی صحت میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ قرآن ہر قسم کی تنقید سے بالا ہے۔ واضح رہے کہ ایمانیات ہمیشہ تنقید کی زد سے بالا ہوتے ہیں۔ یعنی جن امور کے متعلق ہم کہتے ہیں کہ اس پر ہمارا ایمان ہے۔ تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اسے تنقید کی حد سے باہر سمجھتے ہیں جس چیز پر تنقید کی جا سکے اس پر ایمان نہیں ہوتا۔ البتہ ان امور پر غیر مسلم جو تنقید کریں ہم ان کا جواب دیں گے۔

اسی طرح اس فہرست میں جو یہ لکھا ہے کہ "خدا کے وجود کا تخیل۔ اس کی نوعیت اور تاریخی ارتقاء"، سو واضح رہے کہ یہ خیال کہ خدا کا تصور انسان کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتا اور بلند ہوتا رہا ہے، ان لوگوں کا پیدا کردہ ہے جو وحی پر یقین نہیں رکھتے۔ وحی کی رُو سے، خدا کا تصور شروع سے آخر تک یکساں رہا ہے اس میں تاریخی ارتقاء کا کوئی اثر نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے سمجھانے کے لئے ہر دور کے انسان کی ذہنی سطح کے مطابق انداز اختیار کیا گیا ہو۔

تصریحات بالا سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ مسٹر فیضی کے مقالہ کے اسقام اور ہندوستانی مسلمانوں کی خصوصی حالت سے قطع نظر اس وقت حسب ذیل دو اہم سوالات مسلم ارباب فکر کے پیش نظر ہیں۔

(۱) قانونِ شریعت پر نظرثانی کس انداز سے کی جائے۔ اور

(۲) مسلمانوں کے مروجہ عقائد و نظریات کو کس کسوٹی پر پرکھا جائے۔

جہاں تک شق اوّل کا تعلق ہے یہ چیز صرف آزاد اسلامی ممالک ہی میں ممکن ہے اور آزاد ممالک میں، پاکستان اس باب میں سب سے بہتر پوزیشن میں تھا کیونکہ یہاں ابھی تک کوئی خاص آئین یا ضابطہ قوانین شریعت نافذ نہیں ہوا۔ ہمیں توقع تھی کہ یہاں اسلام کے غیر متبدل اور قابل تغیر و تبدل عناصر کا جائزہ، خالص علمی اور عملی سطح پر لے کر، صحیح اسلامی آئین و قوانین کا نظام نافذ ہو سکے گا۔ لیکن افسوس کہ بعض مفاد پرست اور ہنگامہ خیز عناصر نے یہاں ایسا انتشار پیدا کر دیا کہ اس اہم ذمہ داری اور بنیادی فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے جس قسم کی فضا درکار تھی، وہ باقی نہ رہی۔ اگرچہ ہم اب بھی اس باب میں قطعاً ناامید نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اس مقصد کے لئے حالات زیادہ سازگار نہیں رہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر یہاں بھی وہی قدامت پرستانہ مسلک اختیار کر لیا گیا جو دوسرے ممالک میں پہلے سے موجود ہے تو ملک بہت جلد لادینی کی گود میں چلا جائے گا۔ اب زمانہ کے تقاضے زیادہ عرصہ تک جامد قدامت پرستی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر قدامت پرستی کو متبدل اور غیر متبدل کے متوازن امتزاج سے نہ بدلا جائے تو اس کا نتیجہ مذہب سے بیگانگی اور نفرت کے سوا کچھ نہیں ہوا کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ فیضی صاحب نے کہا ہے کہ انہیں اسلامی سوسائٹی کے قیام کا امکان کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا۔

شق دوم پر غور و خوض ہر اسلامی ملک میں ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس کے لئے ہندوستان کی فضا (بحالات موجودہ) سب سے زیادہ ناساعد ہے۔ اس لئے کہ وہاں کا مسلمان، ہندوؤں سے اس قدر مرعوب نظر آتا ہے کہ وہ اپنے عقائد و تصورات میں بھی ہمنوائی کے مسلک ہی میں عافیت سمجھتا ہے۔ یعنی وہ ابوالکلامی مسلک جس کی رُو سے

سمجھا جاتا ہے کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس مفسدہ کے لئے بھی ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی فضا سب سے زیادہ سازگار تھی جو اقبال جیسے بالغ نظر کی فکر اور علامہ اسلم جیسے مجتہد کی قرآنی فکر سے متاثر ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ یہاں قدامت پرستی کی اس غوغا آرائی نے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کسی قسم کی تحقیقاتی کوشش کو ناممکن نہیں تو دشوار ضرور بنا دیا ہے۔ جہاں علمی تحقیق کی چھوٹی سی چھوٹی تحقیق کو ارتداد قرار دے کر "اسلام خطرے میں ہے" کی گھنٹی بجا دی جائے، وہاں مروجہ تصورات و نظریات کو قرآنی محک پر پرکھنے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے؟

بایں ہمہ، اس قدر ناسازگار حالات کے باوجود، اس باب میں اگر کسی سرزمین سے ہماری کچھ امید بندھتی ہے تو اسی خطۂ پاکستان سے بندھتی ہے۔ زود یا بدیر، قرآن کے منشاء کے مطابق صحیح قوانین شریعت کی تدوین اور مسلمانوں کے مروجہ معتقدات و تصورات کو از سر نو قرآن کے قالب میں ڈھالنے کا کام، اگر کہیں ہوگا تو یہیں ہوگا۔ ہم نہیں سمجھتے کہ رجعت الی القرآن کی وہ آواز جو یہاں کی فضا میں اس طرح گونج رہی ہے بے نتیجہ رہ جائے گی۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

لیکن یہ کام خود بخود نہیں ہو جائے گا۔ اس کے لئے بڑی ہمت، استقامت۔ محنت اور ایثار کی ضرورت ہے۔

فردوس گم گشتہ

از پرویز

قیمت — چھ روپے

سلیم کے نام

از پرویز

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ہے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد بلوکیت کے وضع کردہ غلط مذہبی تصورات سے متنفر ہوتے ہوئے اسلام اور اس کے سرچشمۂ حیات قرآن ہی سے ہاتھ دھو چلا تھا۔

یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں

قیمت چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارۂ طلوع اسلام پوسٹ بکس ۷۳۱۳ کراچی

تربیتی مرکز

محترمی پرویز صاحب نے ہفتہ وار طلوع اسلام کی آخری اشاعت میں لکھا تھا کہ اگر کچھ نوجوان طالب علم ایسے ہوں جنہیں صحیح قرآنی تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہو اور وہ اس کے بعد قرآنی فکر کے عام کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر سکیں (یا زیادہ سے زیادہ وقت اس کام کے لئے دے سکیں) تو وہ ان کی اس قسم کی تعلیم و تربیت کے لئے وقت نکالنے کے لئے تیار ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے پاس کچھ استفسارات موصول ہوئے ہیں جن کے پیش نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس تجویز کی مزید تشریح کر دی جائے۔

طالب علم کم از کم گریجویٹ ہونے چاہئیں۔ ایسے بھی جن کے مضامین عربی۔ فارسی۔ تاریخ۔ فلسفہ وغیرہ ہوں۔ اور ایسے بھی جن کی انگریزی کی استعداد بہت اچھی ہو۔ ان سب کے لئے لکھنے اور بولنے کی استعداد نہایت ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ادب سے دلچسپی ہونی چاہیئے۔ نیز انہیں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ایک ایسی انقلابی فکر کی تربیت کے لئے تیار ہو رہے ہیں جس کی اپیل برہان و دانش اور غور و تدبر سے ہے۔ لہٰذا نہ ان میں جمود ہونا چاہیئے نہ تنگ نظری۔ نہ کج بحثی نہ مظلومیت۔ انہیں یہ بھی سوچ لینا چاہیئے کہ جس قرآنی فکر کو طلوع اسلام پیش کر رہا ہے وہ اس سے اپنے آپ کو پورے طور پر متفق پاتے ہیں یا نہیں۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اگر اس قسم کے طالب علم ایک سال تک بھی محترم پرویز صاحب کے زیر تربیت رہ جائیں تو وہ قرآن کے بنیادی تصورات۔ اسلامی نظام زندگی۔ اسلام کی تاریخ۔ اور عصر حاضر کے تقاضوں کے ساتھ قرآنی نظریات حیات کی تطبیق سے بڑی حد تک واقف ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں لکھنے اور بولنے کی ایسی مشق کرا دی جائے گی کہ وہ تحریر اور تقریر کے ذریعے ان خیالات کو آگے پھیلا سکیں۔ عرصہ تربیت کے ختم ہو جانے کے بعد ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں سے موزوں طالب علم ادارہ طلوع اسلام میں ہی کام کرنے لگ جائیں اور یہ بھی کہ وہ دوسرے مقامات میں اسی قسم کے مراکز قائم کر لیں۔ یہ دونوں صورتیں، ان کی معاش کی بھی کفیل ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کے پیش نظر بنیادی طور پر یہ مقصد نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ تربیت محض ان کے حصول معاش کا ذریعہ ہوگی۔ انہیں اس مقصد کو سامنے رکھ کر اس تربیت کے لئے آنا چاہیئے کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ان کی زندگی کا مشن ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو اس مشن کے لئے وقف کر دینا ہے۔ یہی نوجوان محترم پرویز صاحب کے علم و تدبر فی القرآن کے وارث ہوں گے اور ان کے بعد، انہی کی کاوشوں سے یہ دیا جلتا رہے گا۔ پرویز صاحب اپنی بے پناہ مصروفیتوں اور خرابی صحت کے باوجود، اس ہمت طلب مرحلہ کے لئے تیار ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ اس سے یہ سلسلہ آگے بڑھے گا اور ان کی مدت العمر کی کوشش انہی فرہادوں کے ہاتھوں جوئے شیر لائے گی۔ دوران

تربیت میں جو طالب علم اپنا خرچ آپ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ ان کے اخراجات کا کفیل خود مرکز ہوگا۔ جو طالب علم اس تربیتی مرکز میں آنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمیں مطلع کریں اور اپنے خط میں اپنی تعلیم اور دیگر ضروری کوائف حیات کی تفاصیل تحریر فرمائیں انتخاب کا آخری فیصلہ مرکز کے ہاتھ میں ہوگا۔

ان اخراجات کی کفالت کے سلسلہ میں بھی ہمیں بعض حضرات کی طرف سے استفسارات موصول ہوئے ہیں۔ کراچی بہت مہنگا شہر ہے۔ یہاں سب سے اہم سوال رہائش کا ہے۔ اس کے لئے ہمارے پیش نظر کچھ تجاویز ہیں جن کے متعلق آخری فیصلہ اس وقت کیا جا سکے گا جب ہمیں طالب علموں کی تعداد کا اندازہ ہو جائے۔ رہائش کے انتظام کے ساتھ ہمارا خیال ہے کہ ان طالب علموں کی تعلیم کو سامنے رکھتے ہوئے) ان کا خرچ قریب ایک سو روپے ماہوار فی طالب علم ہوگا۔ یعنی ایک سال کے لئے قریب بارہ سو روپیہ۔ جو احباب اس باب میں معاونت کرنا چاہتے ہیں، وہ ہمیں مطلع فرمائیں کہ وہ کس حد تک مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اگر ہمیں ایک طرف موزوں طالب علم مل گئے اور دوسری طرف احباب کی طرف سے اتنی امداد کا یقین ہو گیا جو ان طلباء کے اخراجات کی کفیل ہو سکے۔ تو پھر اس سکیم کو عمل میں لایا جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان طلباء کے لئے اگر احباب کی طرف سے ہمیں اس قدر امداد کا یقین نہ ہو سکا جو ان کے اخراجات کی کفیل ہو سکے تو) ان کے کچھ وقت کے لئے کوئی کام (PART - TIME JOB) تلاش کر لیا جائے جس سے انہیں کچھ آمدنی ہو جائے اور اس طرح مرکز پر ان کا بوجھ کم ہو جائے لیکن اس کے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ ممکن ہے کراچی سے کچھ ایسے طلباء نکل آئیں جو پہلے ہی کچھ کام کر رہے ہوں۔ اس صورت میں بھی اخراجات کی کفایت ہو جائے گی۔ اگر اس باب میں کوئی صاحب ہمیں کوئی اور مفید مشورہ دیں تو ہم اس کے لئے شکر گذار ہوں گے۔

ہمیں طالب علموں اور متوقع معاونین کی طرف سے ضروری اطلاعات ۱۵ فروری تک مل جانی چاہئیں تاکہ ہم عند الضرورت مارچ کے طلوع اسلام میں اس باب میں کچھ مزید لکھ سکیں۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ — کراچی

مجلس اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

باب ششم (مسلسل)

آپ نے اس حکایت کے اتنے حصّے سے اس حقیقت کو بھانپ لیا ہوگا کہ علامہ اقبال کا اشارہ عرب اور ایران کی اس کشمکش کی طرف ہے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں میں تصوف جیسا غیر قرآنی تصور آ گیا۔ مسلمان عرب اپنی قوتوں کے ساتھ ایران کے میدانوں میں گھس گئے اور ان اہل ایران کو بُری طرح سے شکست دی جو اہل عرب کو بڑی نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اہل ایران نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ وہ ان ہی کا دین قبول کر لیں۔ دین تو انہوں نے قبول کر لیا۔ لیکن ان کے سینہ میں انتقام کی آتش خاموش سلگتی رہی۔ وہ میدانِ جنگ میں اپنی شکست کا انتقام نہیں لے سکتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ عربوں کا مقابلہ قوت سے نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے قوت کے بجائے مکر و حیلہ سے کام لینے کی سوچی۔ یہ مکر و حیلہ یہ تھا کہ عرب مسلمانوں کو ان کی قوت کے سرچشمہ سے دور کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان کی قوت کا سرچشمہ قرآنی تصورِ حیات اور اس کا دیا ہوا نظامِ زندگی تھا۔ ایرانی مسلمانوں کے شہروں میں پھیل گئے اور وہاں آہستہ آہستہ اپنے قدیم مجوسی مذہب کے تصورات کو پھیلانا شروع کر دیا۔ عرب ایک صاحبِ قوت قوم تھی جو افلاطون کے فلسفہ اور ارسطو کی منطق سے نا آشنا تھی۔ یہ ایرانی فلسفہ اور منطق کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اسلامی معاشرہ میں ہر طرف پھیل گئے اور اپنے تصورات کو اس انداز سے پھیلانا شروع کر دیا کہ عرب مسلمانوں کا سادہ ذہن اس کا حریف نہ ہو سکا۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے نہایت غیر محسوس طور پر ہوا یہ کہ رفتہ رفتہ قرآنی تصورات ایک ایک کر کے پیچھے ہٹتے گئے اور ان کی جگہ عجمی تصورات نے لے لی۔ نسل پرستی، شخصیت پرستی، ملوکیت - ایک آنے والے کا تصور اور تصوف کے خط و خال دین کے اجزاء بن گئے۔

ان کی ان انفرادی کوششوں کو عباسیوں کی بنا پر سیاست نے اور بھی تقویت دی۔ انہوں نے ان عجمی مسلمانوں کی وساطت سے بنی اُمیّہ کو شکست دے کر سلطنت حاصل کی تھی۔ لہٰذا ان کی سیاست کا تقاضا بھی تھا کہ عربوں کو کچلا جائے اور ان کی جگہ عجمیوں کو کاروبارِ سلطنت میں دخیل رکھا جائے۔ چنانچہ اس طرح یہ عجمی اسلامی معاشرہ کے مؤثر ترین گوشوں پر بھی قابض ہو گئے۔ جس کی وجہ سے ان کے تصورات اور بھی تیزی سے پھیل گئے۔

یہ تھی وہ تدبیر جو اس زیرک اور تجربہ کار بھیڑ نے شیروں کو ان کی قوت سے محروم کرنے کے لئے سوچی۔ چنانچہ علامہ اقبال اس کہانی کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ

گفت با خود عقدہ ما مشکل است　　قلزمِ غم ہائے ما بے ساحل است

اس بھیڑ نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ معاملہ بڑا مشکل ہے۔ ہمارے غم کا سمندر ساحل ناآشنا ہے اس سے نکلنا آسان کام نہیں۔

میش نتواند بزور از شیر رست
سیم ساعد ما، واو پولاد دست

اس نے کہا کہ بھیڑوں کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ طاقت کے ذریعہ شیروں سے نجات حاصل کر سکیں۔ ہماری کلائیاں بڑی نازک ہیں اور شیروں کا پنجہ فولادی۔

نیست ممکن کز کمال وعظ و پند
خوئے گرگی آفریند گوسفند

یہ ممکن نہیں کہ بھیڑوں میں وعظ و نصیحت سے شیروں کی عادت اور قوت پیدا ہو جائے۔ لیکن.....

شیر نر را میش کردن ممکن است
غافلش از خویش کردن ممکن است

یہ ممکن ہے کہ شیر کو بھیڑ بنا دیا جائے۔ اسے اس کے مقام سے اس طرح غافل کیا جائے کہ وہ اپنے آپ کو شیر سمجھے ہی نہیں

چنانچہ اس کے بعد اس بھیڑ نے واعظ کا لبادہ اوڑھ لیا اور دعویٰ کیا کہ اسے خدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے، اور اس انداز سے وہ شیروں کے ہاں پہنچ گئی

صاحب آوازۂ الہام گشت
واعظ شیرانِ خوں آشام گشت

اور....

نعرہ زد اے قوم کذّابِ اشر
بے خبر از یوم نحسٍ مستمر

شیروں کو پکار کر کہا اے فتنہ انگیز اور دروغ باف قوم کے لوگو! تم اپنی قوت کے نشہ میں بدمست ہو اور تمہیں کچھ خبر نہیں کہ تم پر خدا کا عذاب کس قدر جلد آنے والا ہے۔ ایسا عذاب کہ جو آ کر جایا نہیں کرتا۔

مایہ دار از قوتِ روحانیم
بہر شیراں مرسل یزدانیم

مجھے خدا نے شیروں کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔ شیروں کو اگر اس نے جسمانی قوت عطا کی ہے تو مجھے روحانی قوت سے نوازا ہے۔

دیدۂ بے نور را نور آمدم
صاحبِ دستور و مامور آمدم

میں مامور من اللہ ہوں۔ میں خدا کی طرف سے ایک آئینِ شریعت لے کر آئی ہوں۔ میری بعثت کی غایت یہ ہے کہ میں اندھوں کو روشنی عطا کروں۔ میری تم سے نصیحت ہے کہ

توبہ از اعمال نامحمود کن
اے زیاں اندیش فکر سود کن

تم اپنے ناپسندیدہ کاموں سے توبہ کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اس میں تمہارا سراسر نقصان ہی نقصان ہے۔ تم نقصان کو چھوڑ کر اپنے فائدہ کی فکر کرو۔

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است
زندگی مستحکم از نفیِ خودی است

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جو شخص دنیا میں قوت کا استعمال کرتا ہے وہ بڑا ہی بدبخت اور شقی القلب ہے۔ زندگی کا راز قوت میں نہیں خودی کے مارنے میں ہے۔ جو اپنی خودی کو مارتا ہے وہ درحقیقت اپنی زندگی کو مستحکم کرتا ہے

روح نیکاں از علف یابد غذا
تارک اللحم است مقبولِ خدا

خدا کے نیک بندے ہمیشہ سبزی ترکاری پر گزارا کرتے ہیں، حقیقت

یہ ہے کہ روح کی غذا ہی سبزیاں اور ترکاریاں ہیں۔ خدا کے ہاں ہی مقبول ہے جو گوشت کھانا چھوڑ دے۔

تیزیٔ دنداں ترا رسوا کند
دیدۂ ادراک را اعمیٰ کند

دانتوں کی تیزی تیری رسوائی کا موجب ہے۔ اس سے چشم ادراک اندھی ہو جاتی ہے۔

جنت از بہر ضعیفان است و بس
قوت از اسباب خسران است و بس

جنت صرف کمزوروں کے لئے ہے۔ قوت اور طاقت کا مآل نقصان کے سوا کچھ نہیں۔ آسمانی بادشاہت کے مالک صرف غریب اور کمزور ہیں۔

جستجوئے عظمت و سطوت شر است
تنگدستی از امارت خوشتر است

دنیا میں قوت و شوکت اور بلندی و سرفرازی کی تلاش بہت بڑا شر ہے۔ امارت کے مقابلے میں غریبی بہت اچھی چیز ہے۔

برقِ سوزاں در کمینِ دانہ نیست
دانہ گر خرمن شود فرزانہ نیست

اس دنیا میں جس قدر کوئی شخص غریب و ناتواں بن کر جیئے وہ اسی قدر امن میں رہتا ہے۔ کثرت اور بہتات ہمیشہ تباہی کا موجب ہوتی ہے تم نے نہیں دیکھا کہ اگر کہیں ایک دانہ پڑا ہو تو اس پر کبھی بجلی نہیں گرتی۔ بجلی ہمیشہ خرمن پر گرتی ہے۔ لہٰذا ایک دانہ کی یہ خواہش کہ وہ خرمن بن جائے اس کی عقلمندی نہیں حماقت ہے۔

ذرہ شو صحرا مشو گر عاقلی
تا ز نورِ آفتابے برخوری

اگر تو عقلمند ہے تو تجھے چاہیئے کہ ہمیشہ ایک ذرۂ ناچیز بن کر جیئے۔ اور صحرا بننے کی خواہش مت کرے اس لئے کہ آفتاب کی چمک ہمیشہ ذرہ کو عطا ہوتی ہے صحرا کو عطا نہیں ہوتی۔ انوار خداوندی کا مہبط غریبوں اور ناتوانوں کا دل ہے، وسعت اور کثرت پسند امیروں کا نہیں۔

اے کہ می نازی بہ ذبح گوسفند
ذبح کن خود را کہ باشی ارجمند

تم بھیڑوں کو ذبح کرتے ہو اور اس پر بڑا فخر کرتے ہو۔ یہ بات کوئی قابل فخر نہیں تم بھیڑوں کی بجائے خود اپنے کو ذبح کرو۔ اپنے نفس کو مارو۔ اسی میں کامیابی کا راز ہے۔

زندگی را می کند ناپائیدار
جبر و قہر و انتقام و اقتدار

یاد رکھو غلبہ اور تسلط، انتقام اور قوت زندگی کو ناپائیدار بنا دیتے ہیں حیات جاوداں کا راز ضعیفی اور ناتوانی میں ہے۔

سبزہ پامال است و روید بار بار
خواب مرگ از دیدہ شوید بار بار

تم نے نہیں دیکھا کہ گھاس ہر ایک کے پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ ایک حیاتِ تازہ لے کر پھر اگ آتا ہے وہ موت سے مرتا نہیں۔ وہ سو کر اُٹھتا ہے اور اپنی آنکھوں سے موت کی نیند کو دھو ڈالتا ہے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ وہ اس قدر عاجز اور ناتوان ہے کہ ہر ایک کے پاؤں کے نیچے روندے جانے کے باوجود کبھی اُف تک نہیں کرتا۔

غافل از خود شو اگر فرزانۂ
گر ز خود غافل نۂ دیوانۂ

عقل مندی کا ثبوت یہ ہے کہ تو اپنے آپ سے غافل ہو جا۔ اگر تو اپنے آپ کو بھولتا نہیں تو صاحب خرد و ہوش نہیں۔ دیوانہ ہے۔ خود فراموشی سب سے بڑی ہوشمندی ہے۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند

تا رسد فکر تو بر چرخ بلند

تو آنکھ، کان، لب، بند کرکے مراقبہ میں غرق ہو جا تاکہ تیری فکر آسمانوں سے بھی اوپر جا پہنچے، دنیا میں حواس، یعنی علم کے ذرائع، کھلے رکھنے سے فکر میں پستی اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ ان دروازوں کو بند کر دینے سے انسانی فکر حقیقت کی بلندیوں تک جا پہنچتی ہے۔

ایں علف زار جہاں ہیچ است ہیچ

تو برین موہوم اے ناداں مپیچ

یہ دنیا یکسر فریب ہے۔ ساری کائنات سراب ہے۔ یہ مایا کا چکر ہے۔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے۔ تو اس فریب کو حقیقت سمجھ کر اس میں الجھ کر نہ رہ جا۔ اگر تو اس جال میں پھنس گیا تو تجھے کبھی نجات اور مکتی نصیب نہیں ہو سکتی۔

یہ تھا وہ وعظ جو اس ماموریٰ اللہ، صاحب الہام و شریعت، بھیڑ نے شیروں سے جا کر کہا۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت علامہ نے اس تمثالی انداز میں تصوف کی تباہ کن تعلیم کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے افلاطون سے لیکر اس وقت تک تصوف کی کسی خانقاہ میں چلا جائیے یا اس کے کشکول سے کسی صحیفہ کو نکال کر پڑھئے، آپ کو ہر زمانے اور ہر مقام میں یہی تعلیم ملے گی صرف تصوف ہی نہیں بلکہ اس تصوف کی پیدا کردہ "نبوت" کا بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ انگریزوں کی غلامی کے زمانے میں، قادیان کی سرزمین نے جو "نبی" پیدا کیا اس نے بھی آکر یہی وعظ کہا کہ

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال

یہ وعظ اس گوسفندی وعظ سے بھی زیادہ تباہ کن تھا۔ اس لئے کہ اس نے اپنا وعظ شیروں کے گلہ میں جا کر کہا تھا اور مرزا صاحب نے یہ وعظ خود محکوم مسلمانوں کو سنانا شروع کر دیا۔ مقصد بہرحال دونوں کا ایک تھا اور وہ یہ کہ قوت کے استعمال کو خلاف تہذیب و شرف انسانیت بنا کر، طاقتور کو ضعیف اور ضعیف کو ضعیف تر کر دیا جائے۔

چنانچہ اس بھیڑ کے وعظ کا یہ اثر ہوا کہ

خیل شیر از سخت کوشی خستہ بود

دل بذوق تن پرستی بستہ بود

آمدش ایں پند خواب آور پسند

خورد از خامی فسون گوسفند

شیر پہلے ہی اپنی سخت کوشی کی زندگی سے کچھ تھکے ہوئے تھے اور ان کا جی آرام طلبی کی زندگی چاہتا تھا۔ لہذا انہیں بھیڑ کا یہ خواب آور وعظ بہت پسند آیا۔ اور اس طرح وہ اپنی خامی کی بنا پر بھیڑ کے فریب میں آگئے۔ اس مقام پر حضرت علامہ، ایک اور بھی پتے کی بات کہہ گئے ہیں اور وہ یہ کہ اغیار کی سازشیں کتنی ہی محکم کیوں نہ ہوں، انسان پھنستا اس وقت ہی ہے، جب خود اس کے اندر خامی ہو۔ جو قوم پختہ کار اور بیدار و خرد یدہ ہو، اسے دشمنوں کے مکر و حیل کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ غلط تعلیم وہیں کارگر ثابت ہوتی ہے جہاں قوم کے قوائے فکریہ و عملیہ بیکار ہو چکے ہوں۔ بہرحال اس پند گوسفند کا اثر یہ ہوا کہ

آنکہ کردے گوسفنداں را شکار

کرد دین گوسفندی اختیار

وہ شیر جو بھیڑوں کا شکار کیا کرتے تھے انہوں نے خود بھیڑوں کا مسلک اختیار کر لیا۔

با پلنگاں سازگار آمد علف

گشت آخر گوہر شیری خزف

گوشت خور شیر گھاس چرنے لگ گئے اور اس طرح شیروں کی ہیبت اور قوت و شوکت کا گوہر بے مایہ کوڑیوں جیسا حقیر بن کر رہ گیا۔

از علف آں تیزی دنداں نہ ماند
ہیبت چشم شرر افشاں نہ ماند

گھاس کھانے سے دانتوں کی تیزی بھی ختم ہوگئی اور اس سے خون میں اس قسم کی برودت پیدا ہوگئی کہ شیروں کی آنکھوں کے شعلے سب ٹھنڈے پڑ گئے۔

دل بتدریج از میان سینہ رفت
جوہر آئینہ از آئینہ رفت

رفتہ رفتہ شیروں کے سینہ سے اُن کا پُر ہیبت دل نکل گیا۔ اور جب شیر کے سینہ میں دل ہی باقی نہ رہے تو پھر شیر کس طرح باقی رہ سکتا ہے؟ غیر کی شیری ختم ہو جاتی ہے۔ جس طرح اگر آئینہ کا جوہر ختم ہو جائے تو وہ آئینہ باقی نہیں رہتا۔

آں جنون کوشش کامل نہ ماند
آں تقاضائے عمل در دل نہ ماند

وہ جنون جو انہیں ہر خطرہ سے بیگانہ بنا کر بھرپور وار کر دینے پر آمادہ کر دیا کرتا تھا دل میں باقی نہ رہا۔ وہ ولولہ جو انہیں ہر وقت عمل اور حرکت پر تیار رکھتا تھا ختم ہو گیا۔

اقتدار و عزم و استقلال رفت
احتشام و عزت و اقبال رفت

جب سر سے سودا، دل سے ولولہ، بازوؤں سے قوت چلی گئی تو اس کے ساتھ ہی سطوت و اقتدار، عزم و استقلال، ہمت و حرارت شوکت و دبدبہ، اور عزت و اقبال سب رخصت ہو گئے۔

پنجہائے آہنی بے زور شد
مردہ شد دل با تن با گور شد

وہ آہنی پنجہ جو کبھی عقابی شان سے قیصر و کسریٰ کو جھپٹ لیتا تھا، کمزور پڑ گیا۔ اس طرح جسم تو ان کا باقی تھا لیکن چونکہ اُن کے اندر دل زندہ باقی نہ رہا تھا اس لئے وہ جسم نہیں تھے دلوں کی قبریں تھیں۔

زور تن کاہید و خوف جاں فزود
خوف جاں سرمایۂ ہمت ربود

کہاں وہ دبدبہ اور طنطنہ کہ جنگل میں ہر ذی حیات شیروں سے لرزتا اور کانپتا تھا اور کہاں اب یہ حالت کہ شیروں کو خود اپنی جان بچانے کی فکر پڑ گئی۔ اور جب کسی کو جان بچانے کی فکر لاحق ہو جائے تو پھر اس میں ہمت کہاں باقی رہتی ہے؟

صد مرض پیدا شد از بے ہمتی
کوتہ دستی بے دلی دوں ہمتی

جب ہمت باقی نہ رہے تو پھر سینکڑوں امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ انسان پست فطرت ہو جاتا ہے۔ کوتاہ دست بن جاتا ہے نہ اس میں ذوق باقی رہتا ہے نہ ولولہ۔ نہ وسعت قلب و نگاہ نہ کشادگی نظر۔ مختصر یہ کہ

شیر بیدار از فسون میش خفت
انحطاط خویش را تہذیب گفت

زندہ اور پائندہ شیر بھیڑ کی جادوگری سے سو گیا اور قیامت بالائے قیامت یہ کہ اس نے اپنے اس انحطاط کا نام تہذیب رکھ لیا۔ یعنی اگر اسے اس کا احساس رہتا کہ یہ میری پستی اور ذلت ہے تو پھر اس کی حیات تازہ کا کچھ نہ کچھ امکان باقی رہتا۔ لیکن جب اس نے اپنے زوال کو حسن تہذیب تصور کر لیا اور اس پر نازاں ہو گیا تو پھر اسے پستی سے نکالنے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہی۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبال نے اس ایک مثال سے مسلمانوں کی پوری تاریخ کو کس دل کش انداز میں چند اشعار میں سمٹا کر رکھ دیا ہے۔ کہاں وہ دبدبہ شیری اور کہاں یہ مسلک گوسفندی۔ یہ تبدیلی آن کے اندر تصوف نے پیدا کر دی جس کی ساری عمارت نفی خودی کی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اگلے باب میں

یادِ اسلم

علامہ اسلم جیراجپوری کی وفات کی خبر سُن کر ملک کے گوشے گوشے سے احباب نے مجھے تعزیت کے خطوط اور پیغامات بھیجے ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، علامۂ مرحوم کی وفات، ملت کا اجتماعی صدمہ ہے، لیکن احباب نے جن جذبات کے ماتحت انفرادی طور پر مجھ سے اظہارِ غم کیا ہے میرے دل میں ان کی قدر ہے۔ میں ان تمام دوستوں کا دل شکر گذار ہوں اور معذرت خواہ ہوں کہ فرداً فرداً ان کے خطوط اور پیغامات کا جواب نہیں دے سکا۔ ان خطوط میں دو ایسے ہیں جنہیں طلوع اسلام میں محفوظ کر لینا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلا خط علامہ تمنا عمادی مدظلہٗ کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ کل کا پاسبان (دہلی) آج ابھی نظر سے گذرا۔ کل مصروفیت کی وجہ سے دیکھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ بھائی علامہ اسلم جیراجپوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی خبر دیکھ کر دل بیٹھنے لگا۔ پرچہ ہاتھ سے گر گیا، دیر تک آنکھوں سے اشک جاری رہے۔ مرحوم سے ملنے کا موقع تو کبھی نہیں ملا۔ مگر روحانی ملاقات و ایمانی محبت ہم دونوں میں کافی تھی۔ اسوقت میرے دل کی کیا کیفیت ہے لکھ نہیں سکتا۔ برادر محترم شمس العلماء مولانا حافظ محب الحق رحمۃ اللہ کا غم تازہ ہو گیا۔ جذبات غم کے ہیجان میں کچھ مصرعے ذہن میں بلا ارادہ آنے لگے تو بلا ارادہ ان کو فوراً رباعیوں کے قالب میں ڈھال لیا۔

چھاتی پہ دھری صبر کی سل، بیٹھ گیا — میں کھینچ کے آہِ جانگسل، بیٹھ گیا
اک ہوک اٹھی تمہارے اٹھ جانے سے — بھائی! تم اُٹھ گئے تو دل بیٹھ گیا

ہے سنگِ الم سے چور سینا کیسا — خونابۂ غم پڑا ہے پینا کیسا
احباب گئے، مزا گیا جینے کا — جینے کا مزا گیا تو جینا کیسا

جانا اوروں نے بھی، مگر کم تم کو ۔۔۔ تم ہم کو جانتے تھے اور ہم تم کو

افسوس کہاں سے اب پکڑ لائیں ہم ۔۔۔ اسلم، جیراجپوری اسلم! تم کو

اللہ تعالیٰ مرحوم بھائی کو جنت الفردوس میں بہتر سے بہتر جگہ دے۔ اور ان کے پسماندوں کو صبر جمیل اور اس کا اجر جزیل عنایت فرمائے۔ مرحوم سے ملنے کی حسرت ہی رہ گئی۔ مگر غم نہیں انشاء اللہ بہت جلد ہی میں بھی وہیں پہنچتا ہوں پھر تو اطمینان سے ملاقاتیں رہیں گی۔ بھائی شمس العلماء مولانا محب الحق رحمۃ اللہ نے پہل کی تھی۔ وہ ہم دونوں سے بڑے تھے۔ بھائی اسلم رحمۃ اللہ مجھ سے بڑے تھے اس لئے وہ آگے بڑھ گئے۔ اب تو میری ہی باری ہے۔ بلاوے کا انتظار ہے لبیک کہنے کے لئے ہر وقت تیار ہوں۔

دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ

اس وقت میں اپنے دل کی کیفیت کچھ عجیب سی پا رہا ہوں جس کو لفظوں میں تحریراً یا تقریراً کسی طرح بھی ادا نہیں کر سکتا۔ لیجئے اب رخصت۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ شمس العلماء مولانا حافظ محب الحق اور مولانا اسلم جیراجپوری رحمہ اللہ تعالیٰ دونوں کو اپنے جوار رحمت و غفران و رضوان میں وہ جگہ مرحمت فرمائے جو بہتر سے بہتر ہو۔ اور مجھ کو بھی جب بلائے تو اسی منزل میں ان دونوں کا ہم نشیں بنائے۔ آمین

آپ کا شریک غم

تمنا عمادی غفرلہٗ ۔۔۔ ۵ر جنوری ۱۹۵۶ء

دوسرا خط، علامہ مرحوم کے چھوٹے لڑکے، عزیزم حکیم محمد معظم سلمہٗ کا ہے۔ اس سے مرحوم کے حیات ارضی کے آخری چند دنوں کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

بھائی جان! ۱۸ر دسمبر کو ابا کے بار بار منع کرنے کے باوجود میں نے انڈسٹریل نمایش کو بہانہ بنایا اور دہلی پہنچ گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ ان کو کس قدر خوشی ہوئی۔ جوش الفت میں میرے بدن پر بار بار ہاتھ پھیرتے تھے۔ ۱۵ر ستمبر کے بعد جبکہ ان کو دل کا دورہ پڑا تھا اور اس سے انہوں نے ہم سب لوگوں کو بے خبر رکھا تھا) اُن کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ میں پانچ چھ روز تک ان کے پاس رہا۔ ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں دیکھا۔ البتہ خوراک میں کمی ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ذہنی طور پر اپنے آپ کو کمزور نہیں پاتے تھے۔ آنے جانے والوں سے اسی شان سے گفتگو کرتے تھے۔ یعنی حُقہ کی نے منہ میں دبی ہوئی ہے اور باتوں

کا سلسلہ جاری۔ ان دنوں میں نے یہ بھی دیکھا کہ طبیعت کچھ ہنسنے ہنسانے کی طرف زیادہ مائل ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے باوجودیکہ زیادہ گفتگو سے منع کر دیا تھا اور لوگوں پر پابندی لگا دی تھی۔ مگر کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹر کو ان سب باتوں پر پابندی لگانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لوگ میرے پاس آئیں گے اور خوب جی بھر کر باتیں کریں گے۔ ہاں اتنا ہو سکتا کہ لوگ اپنے طور پر میرے پاس نہ آئیں، بلکہ جب میرا جی چاہے تو میں بلا لیا کروں گا۔ اور اُن کا جی تو ہر دم یہی چاہتا تھا کہ لوگ آئیں اور باتیں ہوتی رہیں۔ دل نہیں تھا اتھاہ سمندر تھا جس میں محبت کی موجیں لہریں مارتی رہتی تھیں۔ ۲۵ دسمبر کو جب مجھے پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ ان کی حالت اب بہت بہتر ہے اور یہ امید ہے کہ ہفتہ عشرہ میں نارمل حالت ہو جائے گی تو میں شام کی گاڑی سے واپسی کے لئے روانہ ہو گیا۔ بہت خوشی سے رخصت کیا لیکن سواری میں بٹھاتے وقت ان کے چہرہ پر کسی نامعلوم اثر کے ماتحت جو اداسی سی چھا گئی، میں اپنی تمام عمر کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ وہ میری اور ان کی آخری ملاقات تھی۔ کون جانتا تھا کہ ان کی یہ کیفیت اس بات کی آئینہ دار تھی کہ جاؤ تم کو خدا کے سپرد کیا۔ آج جب بھی اس منظر کو یاد کرتا ہوں کلیجہ اینٹھ جاتا ہے۔ ۲۵ دسمبر کی شام میرے لئے کتنی منحوس شام تھی، میں وہ چیز چھوڑ کر جا رہا تھا جس کو اب کبھی نہ پا سکوں گا۔

۲۶ ہی کو صبح کے وقت آپ کے بھیجے ہوئے ایک صاحب ملنے آئے[1]۔ انہوں نے کہا کہ پرویز صاحب نے مجھے آپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے بھیجا ہے خطوط سے پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ ہنس کر بولے کہ دیکھ لو میں تو اللہ کے فضل سے بالکل اچھا ہوں۔ پرویز صاحب سے کہہ دینا میری طرف سے مطمئن رہیں۔ اور میرے پاس ان کو دینے کے لئے کچھ نہیں سوائے دعا کے اور وہ میں برابر ان کے حق میں کرتا رہتا ہوں۔

۲۸ دسمبر کو کھانا وغیرہ کھا کر دوپہر کو دھوپ میں نہایت آرام سے لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے اور طلوع اسلام پڑھ رہے تھے کہ اسی دوران میں بلاوا آ گیا اور چند لمحوں کے اندر بلا کسی جد و جہد کے آغوش رحمت میں پہنچ گئے۔ جامعہ ملیہ کے نئے قبرستان میں ان کو اسی روز شام ۷½ بجے سپرد خاک کر دیا گیا۔ گھر پر سوائے عظیم میاں کے اور نوکر کے کوئی اور موجود نہیں تھا۔ مجھ کو ۲۹ دسمبر کی صبح ۹ بجے تار ملا۔ جو ۲۸ ہی کی شام کو روانہ کیا گیا تھا، اور میں اسی روز شام کی گاڑی سے روانہ ہو کر دوسرے روز شام کو پہنچ گیا۔ آج میرے واسطے چشم براہ وہاں کوئی نہ تھا۔ کمرہ سونا پڑا ہوا تھا، چارپائی خالی تھی، بستر ہٹا دیا گیا تھا۔ میں ایک یتیم کی طرح کمرہ میں کھڑا ہوا تھا۔ آج میں اپنے کو انتہائی بے بس اور مجبور پا رہا تھا۔ ماں اور باپ میرے لئے جو کچھ تھے وہی تھے۔ چھ برس کی عمر سے میں ان کے ساتھ تھا۔ وہ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں ان کی چارپائی سے سر ٹکرا دوں۔

پرویز بھائی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ وہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے۔ مگر طبیعت کو کیسے سمجھاؤں۔ میں تو صرف ان کی دعاؤں کے سہارے زندہ تھا۔ اب وہ زندگی کی روح مجھ میں کون پھونکے گا۔ مجھ میں آخر تک

[1] منشی فضل الٰہی صاحب۔ جن کے کارخانے میں طلوع اسلام کی جلد بندی کا کام ہوتا ہے۔

ذمہ داری کا احساس پیدا نہیں ہوا۔ میں کیسے بتاؤں کہ زندگی گذارنا میرے لئے اب کس قدر دشوار ہو گیا ہے۔ میرے آگے دو پیش سوائے پریشانیوں کے اور کچھ نہیں اور اس کے لئے میں پہلے سے کبھی تیار نہیں تھا۔

مجھ کو اس کا احساس ہے کہ ایک کے غم سے آپ کا سینہ بھی اسی قدر چھلنی ہے جتنا ہمارا، اگر ہم ان کے گوشت کے ٹکڑے ہیں تو آپ کے قلب و جگر میں بھی روحِ اسلم ہی کی حرارت ہے اور یہ بھی آپ یقین رکھئے کہ آپ کے دل میں اعظم و منظم کے لئے جتنی محبت تھی پرویز کے لئے اس سے کم نہیں تھی۔ آپ کے خط میں جہاں دیر ہو جاتی تو ان کو بیتاب ہو جاتے بھی دیکھا گیا ہے۔

آپ کا غمزدہ بھائی

محمد منظم جیراجپوری

۲۰ رجنوری ۱۹۵۶ء　　　(اعظم گڑھ)

ہاں عزیزم! مجھے اس کا علم ہے کہ ان کے دل میں میرے لئے کتنی جگہ تھی۔ ان کی موت سے میری زندگی میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ اب پُر نہیں ہو سکتا۔ اس کا بدل یہی ہے کہ جس قرآنی فکر کے عام کرنے میں انہوں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اسے اب اور زیادہ تیزی اور گہرائی سے عام کیا جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

پرویز

بزمِ طلوعِ اسلام، لاہور کی طرف سے ذیل کا رزولیوشن موصول ہوا ہے۔

آج جمعہ کی نماز کے بعد بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں مندرجہ ذیل قرار داد منظور ہوئی:۔

"بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا یہ اجلاس حضرت علامہ اسلم جیراجپوری استاد جامعہ ملیہ دہلی کی وفات حسرت آیات پر نہایت رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

علامہ صاحب کی وفات اس صدی کا ایک بہت بڑا المناک سانحہ ہے۔ ان کی رحلت سے قرآنی علوم و ریسرچ کا ایک چشمہ ہے کہ بند ہو گیا ہے۔ ان کی لکھی ہوئی کتب اور ان کے مضامین اُمتِ مسلمہ کے لئے ایسا زندہ و پائندہ ذخیرہ ہے جس سے قرآن حکیم کے شیدائی ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔ علامہ مرحوم کا قرآن مجید سے والہانہ لگاؤ اور اُن کی جامعہ ملیہ کے لئے قربانی ایسے واقعات ہیں جن کے سامنے قرآنی مکتب فکر کے شیدائی ہمیشہ انہیں یاد رکھیں گے۔

بزمِ طلوعِ اسلام لاہور، کا یہ اجلاس علامہ مرحوم کے لواحقین، ادارۂ طلوعِ اسلام کراچی اور جامعہ ملیہ دہلی سے نہایت غم والم کا اظہار کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کی روشن کردہ قرآنی شمع اپنی تابناکیوں سے تمام عالم کو بقعۂ نور کر دے۔ آمین۔ اس قرار داد کی نقلیں جامعہ ملیہ دہلی۔ ادارہ طلوعِ اسلام کراچی اور علامہ مرحوم کے لواحقین کو ارسال کی جائیں۔

پانچ ہزار راتیں گذر گئیں

(وزیرِ بحالیات توجہ فرمائیں)

ترّی باسی اٹلی کے ایک خوشحال زمیندار کا لڑکا تھا اور روم میں ایک سرکاری دفتر میں ملازم۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں جب پناہ گزین جوق در جوق روم میں آنے شروع ہوئے تو ان کے مصائب و مشکلات کو دیکھ کر ترّی باسی کا جی بھر آیا وہ رضاکارانہ طور پر ایک ہسپتال میں بطور چپراسی کے کام کرنے لگ گیا۔ ایک رات کا ذکر ہے کہ ترّی باسی نے اپنے کمرہ کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے اندھیرے میں کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے نیچے جا کر دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی چیتھڑوں میں ملبوس ہے۔ اس نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا کہ وہ "کیسی نو" سے پاپیادہ روم تک آیا ہے۔ وہاں ہوائی حملہ میں اس کا سارا خاندان تباہ ہو گیا ہے۔ ترّی باسی نے اس بوڑھے پناہ گزین کو اٹھایا اور ہسپتال میں لے آیا۔ اس کا بیان ہے کہ راستہ میں اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی معصوم سی لڑکی بالکل سفید لباس میں ملبوس اس سے کہہ رہی ہے کہ اُسے غریب، محتاج اور خانماں خراب پناہ گزینوں کی خدمت کے لئے چن لیا گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد اس نے آپ کو اس مقدس فریضہ کے لئے وقف کر دیا۔ پانچ ہزار راتیں گذر چکی ہیں۔ ترّی باسی کا اس وقت سے آج تک معمول یہ ہے کہ وہ ہر رات، کھانے پینے کی اشیاء، پرانے کپڑے، جوتے، جرابیں، کمبل، جو کچھ اسے میسر آتا ہے بوری میں بھر لیتا ہے اور ان بوروں کو اپنی پیٹھ پر لاد کر روم سے باہر ویرانوں میں پڑے ہوئے پناہ گزینوں کے پاس لے جاتا ہے۔۔۔ بھوکے کو روٹی، ننگے کو کپڑا، بیمار کو دوائی، محتاج کو پیسے، افسردہ کو تسکین دیتا ہے۔ رات بھر وہ ان کی خدمت میں رہتا ہے۔ علی الصباح واپس آ کر تھوڑا سا سوتا ہے۔ اس کے بعد اُٹھ کر پھر دوسری رات کے لئے انہیں چیزوں کے جمع کرنے میں لگ جاتا ہے۔ سارا دن یہ کام اور ساری رات وہ کام۔۔۔ اسے یہ کچھ کرتے ہوئے پانچ ہزار راتیں گذر گئی ہیں۔

پہلے وہ یہ سب کچھ "تنہا" کرتا تھا۔ پھر اس کے بے پناہ جذبۂ ایثار و خدمت سے متاثر ہو کر چار اور دوست بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ایک روم کا شاہزادہ۔ ایک نوجوان طالب علم۔ شہر کا ایک تاجر اور ایک ریٹائرڈ فوجی افسر۔۔۔ اب ان پانچوں رفقاء کا گروہ ان خانماں خراب پناہ گزینوں کے لئے دن بھر امداد کا سامان تلاش کرتا، بیماروں کو ہسپتال میں داخل کراتا۔ بیروزگاروں کے لئے روزگار تلاش کرتا۔ بھولے بھٹکوں کو ان کی منزل تک پہنچاتا۔ جنہیں قانونی مشوروں کی ضرورت ہو ان کے لئے اس قسم کے مشیر فراہم کرتا، جن کی دستاویزیں گم ہو چکی ہوں ان کی بازیابی کی صورت پیدا کرتا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے فرائض شبینہ کی سر انجام دہی کے لئے سامانِ خوراک، ضروریاتِ زندگی اور ادویات کے بورے بھی بھرتا ہے

اور پھر شب بھر ضروری مقامات میں ان کی تقسیم کرتا ہے۔ چنانچہ پچھلے سال جب ان کی ایک رات کے بوروں کی تعداد ستر تک پہنچ چکی تھی، انہی کے پوپ نے انہیں ایک موٹر کار تحفتاً دی تاکہ ان کا یہ کام آسان ہو جائے۔

ستری باسی کا کسی مذہبی فرقے سے تعلق نہیں۔ اس نے اس کام کو اپنے لئے زندگی کے مشن کے طور پر اختیار کر رکھا ہے اور وہ اس سے بڑا مطمئن ہے۔ وہ جب کسی محتاج کی امداد کرتا ہے اور اسے کچھ دیتا ہے تو اس کے چہرہ پر اس قسم کے مسرت افزا تاثرات جھلک آتے ہیں گویا وہ کسی کو کچھ دے نہیں رہا بلکہ اس سے کچھ لے رہا ہے۔ اسے محتاجوں کی مدد کے لئے غلیظ اور گندی جگہوں تک جانا پڑتا ہے۔ ویرانوں میں۔ کھنڈرات کے کونوں اور کھدروں تک۔ گھنے جنگلوں میں درختوں کے نیچے۔ پہاڑیوں میں غاروں کے اندر۔ غرضیکہ جہاں جہاں بھی پناہ گزین اپنا سر چھپا ہیں، ستری باسی اور اس کے رفقا ان کی مدد کے لئے وہاں جا پہنچتے ہیں۔ نہ معلوم اس دوران میں وہ کتنے پناہ گزینوں کو کام پر لگا چکے ہیں۔ کتنے مریض ان کی کوششوں سے صحت یاب ہو چکے ہیں۔ کتنے فاقہ زدہ بھوکوں کی جان بچی ہے۔ ایسے محتاج جو کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے ٹھٹھر ٹھٹھر کر مرجاتے، صحت اور سلامتی سے اپنے بچوں کا پیٹ پال رہے ہیں۔ کتنے بے گھروں کو گھر مل چکے ہیں۔ کتنے یتیم نئے نئے خاندانوں کے افراد بن چکے ہیں اور یہ سلسلہ بلا کسی مزد و معاوضہ کے نہایت خاموشی سے مسلسل بدستور جاری ہے پانچ ہزار راتوں سے مسلسل جاری۔

(ماخوذ از ریڈرز ڈائجسٹ۔ دسمبر ۱۹۵۵ء)

اے کاش! انہی سے سنگ مرمر اور باورچی منگانے کے بجائے دو چار ستری باسی منگا سکتے!

روٹی کا مسئلہ

انسان کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے اور ہمیشہ تک رہے گی۔

آج تک انسان نے اس مسئلہ کو کیسے حل کیا؟ اس کا جواب تلاش کیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ اس نے بدن کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی جان کو رہن رکھ دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا تدبیر اختیار کی جائے کہ انسان کا بدن اور اس کی جان دونوں سلامت رہیں؟ اس کے لئے ہمیں قرآن سے رجوع کرنا ہوگا

قرآن کا حل

نظامِ ربوبیت

از پرویز

میں ملے گا جو بلاشبہ دور حاضرہ کی عظیم کتاب ہے

قسم اول — چھ روپے

قسم دوم — چار روپے

ادارہ طلوع اسلام پوسٹ بکس ۳۱۳ کراچی

حقائق و عبر

۱— محی السنۃ! پچھلے دنوں جب حجاز کے بادشاہ، سلطان سعود ہندوستان آئے تو مسلمانوں کی بڑی بڑی مذہبی جماعتوں نے ان کی خدمت میں ایڈریس پیش کئے ان خطابات میں انہیں خاص طور پر محی السنۃ کہا گیا۔ یعنی سنت رسول اللہ کا زندہ کرنے والا۔ ایک تو حجاز کا بادشاہ۔ پھر اہل حدیث! اس کے محی السنۃ ہونے میں شبہ کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن سنت رسول اللہ کے اس سب سے بڑے متبع اور محی کے ذاتی اخراجات کے متعلق کچھ تفاصیل اخبارات میں شائع ہوئی ہیں جو قابل غور ہیں۔ ان میں سے بعض باتیں (روزنامہ آفاق۔ لاہور کی ۳۰ دسمبر کی اشاعت کے حوالہ سے) درج ذیل کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

شاہ سعود جب ہندوستان آئے تو وہاں انہوں نے فراخ دلی سے تحائف اور نذرانے پیش کئے لیکن کوئی نذرانہ قبول نہیں کیا۔ وہ لین دین کے قائل نہیں۔ صرف دین کے قائل ہیں۔ اس سال کے شروع میں وہ ایران گئے تھے تو انہوں نے ملکہ کو ۵۰۰ ڈالر کے ہیروں سے جڑے زیورات نذر کئے تھے۔ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے شاہ فیصل کی تاج پوشی کے جشن میں شرکت کی تھی تو عراقیوں کو ۸۰ ہزار ڈالر نقد، دو کیڈلک کاریں۔ اور ایک شیورلیٹ کار عطا کی۔

پچھلے دنوں وہ ہندوستان آئے تو پنڈت نہرو کی صاحبزادی اندرا کو سونے کا ایک جھومر اور ہیروں سے جڑی ہوئی کلائی کی گھڑی پیش کی۔ شملہ میں انہوں نے چائے کی ایک پیالی کا بل ۴۰۰ ڈالر ادا کیا۔ ان کی موٹر سڑک سے گذر رہی تھی تو ایک کسان کا مرغی کا بچہ اس کی زد میں آکر کچل گیا انہوں نے کسان کو تلافی کے طور پر ۲۰ ڈالر عطا کئے۔ بنارس میں انہیں اعزازی ڈگری دی گئی۔ وہاں انہوں نے یونیورسٹی کے طلبہ کی ایک یونین کو دس ہزار ڈالر چندہ دیا اور علی گڑھ میں اپنی موٹر چلانے والوں کو ۶۰۰ ڈالر بخشے۔

آجکل اگر دنیا میں کوئی مطلق العنان حکمران باقی رہ گیا ہے تو وہ شاہ سعود ہی ہیں۔ دنیا بھر میں ان کی دولت کا شہرہ ہے لیکن چونکہ انہوں نے نہ تو کبھی اپنی آمدنی کے متعلق کوئی بات بتائی ہے اور نہ اخراجات کے متعلق کوئی ذکر کیا ہے، اس لئے کسی کو صحیح طور پر نہیں معلوم کہ اس بادشاہ کا کتنا خزانہ ہے۔ "مشرق وسطیٰ کے امور" کے ایڈیٹر ڈاکٹر شارمان نے بڑا حساب لگا کر کچھ ان کی آمدنی کا اندازہ لگایا ہے۔

پچھلے سال شاہ سعود کو عربی امریکی تیل کمپنی کے کنوؤں کی رائلٹی اور ٹیکس ملا کر بیس کروڑ ڈالر کی رقم ملی تھی۔ شاہ نے یہ رقم

پانی کی طرح بہائی۔ اور پانچ کروڑ ڈالر سے خرچ کر ڈالے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک انہیں تیل کی آمدنی کے طور پر اندازاً ایک ارب ۴۰ کروڑ ڈالر مل چکے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ ساری دولت کہاں جاتی ہے۔ شاہ سعود پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں اور فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں لیکن یہ روپیہ مملکت کے کاموں پر کم اور ان کی ذات کے حوالے سے زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ شاہی گھرانے کے امور پر خرچ کا تخمینہ پونے تین کروڑ ڈالر کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں صحتِ عامہ تعلیم اور سماجی امور کا بجٹ کل ملا کر ایک کروڑ سات لاکھ ڈالر ہوتا ہے۔ شہزادوں و شہزادیوں کو جو تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں۔ اور شیوخ کو جو وظیفے دیئے جاتے ہیں، ان پر خرچ ہونے والی رقم کا کوئی حساب نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ کے بعض ماہرین کا خیال ہے۔ کہ شاہ سعود پانچ کروڑ ڈالر سالانہ صحرائی قبائل کو اپنی مٹھی میں رکھنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

مرحوم شاہ ابن سعود کے ۴۰ بیٹے تھے۔ موجودہ شاہ ان چالیسوں میں سب سے بڑے ہیں۔ ولی عہد شہزادہ فیصل ان کے بھائی ہیں۔ اگرچہ باپ نے مرتے وقت دونوں سے حلف اٹھوایا تھا کہ آپس میں بالکل نہیں لڑیں گے۔ اس کے باوجود ان میں آپس میں خاصی رقابت چلتی ہے۔ شاہی نسل کے افراد کل ملا کر ۳۲۲ ہیں۔ ان پر ۳۲ ہزار ڈالر سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ محلات کی دیکھ بھال۔ سیر و سفر کے اخراجات اور اس قسم کے دوسرے اخراجات اس سے الگ ہیں۔

ان اخراجات میں تو کوئی خصوصیت نہیں۔ ملوکیت جہاں بھی ہوگی یہی کچھ ہوگا۔ ہم نے جس مقصد کے لئے ان تصریحات کو پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ کے بادشاہوں کو تو بادشاہ سمجھتے ہیں لیکن مسلمان بادشاہوں کو ظل اللہ۔ اور اگر ان میں سے کوئی نماز روزے کا پابند ہو تو پھر تو اس کا پوچھنا ہی کیا! وہ دین کا ستون ہے اور سنتِ رسول اللہ کا سب سے بڑا محافظ! ہماری تاریخ میں پہلے سے بھی یہی کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ یہ تو صرف قرآن کا آئینہ ہے جس میں ہر شے اپنے اصلی رنگ میں سامنے آجاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ملوکیت اور پیشوائیت کی مشترکہ سازشیں اس آئینہ کو مشترکہ غلافوں سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتیں۔

۲۔ زندگی کے دن

کسے معلوم نہیں کہ زندگی بڑی قیمتی چیز ہے اور وقت، متاعِ بے بہا۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انکی زندگی کی یہ بے بہا متاع، صرف کس طرح ہوتی ہے؟ مغرب کے ماہرین اعداد و شمار نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ اگر کسی انسان کی عمر ستر سال کی ہو، تو اس کے اوقات کی تقسیم کس طرح سے ہوتی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ایک شخص کی زندگی کے کم سے کم چھ سال کھانے کی میز پہ چمچے، چھری اور کانٹے سے کھیلتے ہوئے گذر جاتا ہے۔ اس عرصہ میں وہ بیس من روٹیاں تیس ہزار انڈے ۶ من آلو اور بارہ من سبزیاں اور میوہ جات کھا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں۔ ایک شخص اوسطاً زندگی میں ایک من تمباکو کھا جاتا ہے یا پی جاتا ہے اور بیس ہزار گیلن شراب پیتا ہے۔ ایک شخص اپنی زندگی میں پانچ سال چلتے پھرتے گذارتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ عالمی دورہ کرے بلکہ اس کمرے سے دوسرے کمرہ میں۔ سیڑھیوں پر چڑھنے اترنے میں۔ یعنی اسی طرح چلتے ہوئے پانچ سال ختم ہو جاتے ہیں۔

ماہرین اعداد و شمار نے بتایا ہے کہ اوسطاً زندگی میں ایک مرد ۴ گھنٹے ۴ سال اور ایک عورت ۵ سال گفتگو میں صرف کرتی ہے۔ تعلیم میں اوسطاً صرف تین سال صرف ہوتے ہیں۔ یعنی خاموش بیٹھے ہوئے استادوں کی باتیں سننا۔ لکھنا یا چپ چاپ پڑھنا۔ یہ عام لوگوں کی حالت ہے۔ اسکالروں کی عمر کا چھ سال کا عرصہ اس مشغلہ میں گذر تا ہے۔ ایک شخص کی زندگی کے ۴ ہزار گھنٹے تاش کھیلنے، کرکٹ کھیلنے یا دوسری تفریحوں میں ختم ہوتے ہیں۔ پانچ سال کپڑا بدلنے، داڑھی بنانے، سنگار کرنے میں ختم ہوتے ہیں۔ ایک آدمی اپنی زندگی میں پانچ ماہ جوتے کے فیتے ٹھیک کرتا رہتا ہے اور ٹیلیفون پر ایک سال، بیماری میں تین سال صرف کر دیتا ہے۔ ناک سڑکنے میں زندگی کے تین ماہ صرف ہوتے ہیں۔ ایک آدمی ستر دن آئینہ دیکھتا ہے اور دو سے چار سال سگریٹ پینے میں صرف کرتا ہے۔ سب سے زیادہ المناک بات جو ماہرین نے بتائی ہے وہ یہ ہے کہ ایک انسان اپنی اوسط زندگی میں عام طور پر بلا وجہ تین سال انتظار کرنے میں گذارتا ہے۔ کام کرنے کے لئے زندگی کے صرف ۱۴ سال ملتے ہیں۔

واضح رہے کہ کام کرنے کے لئے ۱۴ سال اسی صورت میں ملتے ہیں جبکہ انسان کی عمر ستر سال کی ہو۔ لیکن یورپ میں ایک مرد کی زندگی کی اوسط تقریب ۵۸ سال اور عورت کی تقریب ۶۲ سال ہے۔ اس نسبت سے اندازہ لگائیے کہ انسان کو کام کرنے کے لئے فی الواقع کتنا وقت ملتا ہے۔

اور یہ اعداد و شمار یورپین ممالک کے ہیں جہاں زندگی کی اوسط ۵۸ سال ہے۔ ہمارے ہاں جہاں زندگی کی اوسط اس سے آدھی بھی نہیں، کام کرنے کے لئے جس قدر وقت مل سکتا ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے!

سوچئے کہ زندگی کی اس قدر عزیز ترین متاع کن باتوں میں ضائع ہو جاتی ہے اور پھر ہم میں سے کتنے ہیں جو کام کرنے کے وقت میں بھی کام کرتے ہیں؟ انسان بڑا ہی ظالم و جاہل واقعہ ہوا ہے۔

۳۔ کون ذمہ دار ہے؟

ذیل کی خبر پڑھئے جو لاہور کے اخبارات میں شائع ہوئی ہے:۔

لاہور۔ ۱۲ر جنوری۔ آج ایبک روڈ، انارکلی اور میو روڈ سے اقدام خودکشی کی دو وارداتوں کی اطلاع ملی ہے۔ پہلی واردات میں ایک نوجوان شہاب الدین نے بیکاری اور مفلسی سے تنگ آکر زہر کھا لیا۔ اسے میو ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے جہاں اس کی حالت ابھی تک خطرناک بتائی جاتی ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ شہاب الدین مہاجر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اس کے والد نے لاہور پہنچ کر ایک اور شادی کر لی اور شہاب الدین اس کی والدہ اور اس کے بہن بھائیوں کو گھر سے نکال دیا۔ اس نے اپنی والدہ اور بہن بھائیوں کے ہمراہ ایبک روڈ احاطہ دیوان چند میں سکونت اختیار کر لی اور چاندی کے ورق بنانے کے کام پر ملازم ہو گیا۔ جہاں سے اسے ۵۰ روپے ماہوار ملتے تھے۔ اس قلیل سی رقم میں وہ بمشکل گھر کے اخراجات پورے کر رہا تھا کہ شومئی قسمت سے اس کا ایک ہاتھ مشین میں آکر کٹ گیا اور اسے ملازمت سے جواب مل گیا۔ شہاب الدین نے جواب کچھ ہوش میں آچکا ہے آج بتایا کہ ہاتھ کٹ جانے

اور ملازمت سے جواب مل جانے کے بعد اس نے اپنا اور بہن بھائیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے چھابڑی لگا کر چنے بیچنا شروع کر دیئے تھے، لیکن ہر بار پولیس نے یا تو اس کا چالان کر دیا یا اسے بازار سے اُٹھا دیا۔ تین دن گذرے کہ کارپوریشن کے عملہ نے اس کی چھابڑی اٹھا کر پھینک دی اور سب چیزیں بازار میں ضائع ہو گئیں۔ اس وقت سے لے کر اس کی والدہ اور بہن بھائی بھوکے تھے ان کی یہ حالت اس سے نہ دیکھی گئی اور اس نے مایوسی کی حالت میں زہر کھا لیا۔ (تسنیم۔ ۱۸ جنوری)

خبر آپ نے پڑھ لی۔ کارخانہ کا مالک شہاب الدین کو برطرف کرنے میں حق بجانب تھا۔ بالکل ٹھیک۔ وہ اس مزدور کو رکھ کر کیا کرتا جس کا ہاتھ کٹ چکا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا ہاتھ کام کرتے ہوئے ہی کٹا تھا!) پولیس والے شہاب الدین کو بازار سے اٹھا دینے یا اس کا چالان کر دینے میں حق بجانب تھے۔ اس لئے کہ ان کے قانون کا یہی تقاضا تھا۔ کارپوریشن والے بھی اس کی چھابڑی اُلٹ دینے میں حق بجانب تھے اس لئے کہ اُن کے قواعد و ضوابط اُس کی بے ضابطگی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب پولیس والے شہاب الدین کا چالان کریں گے اور غالباً اُسے سزا بھی ہو جائے گی۔ کیونکہ ضابطۂ تعزیرات کی رُو سے خودکشی جرم ہے۔ مُلّا اسے گناہگار قرار دے کر آخرت میں جہنم رسید کر دے گا کیونکہ شریعت بھی خودکشی کی اجازت نہیں دیتی۔

یہ سب اپنی اپنی جگہ پر حق بجانب ہیں! لیکن ان میں سے کوئی ہے جو اس کا جواب دے کہ جن حالات سے مجبور ہو کر شہاب الدین اس اقدام پر مجبور ہو گیا اس کا ذمہ دار کون ہے؟ یقیناً شہاب الدین نہیں۔ اگر خودکشی جرم ہے، تو جو معاشرہ اپنے ایک فرد کو اس جرم کے ارتکاب پر مجبور کر دیتا ہے کیا وہ بھی برابر کا مجرم نہیں؟ لیکن شہاب الدین سے مؤاخذہ کرنے والے تو کئی ہیں، سوال یہ ہے کہ اس مجبور معاشرہ سے مؤاخذہ کرنے والا بھی کوئی ہے؟ یاد رکھئے۔ جس نظام میں معاشرہ سے مؤاخذہ کرنے والا کوئی نہ ہو، وہ نظام اسلامی تو ایک طرف انسانی بھی نہیں کہلا سکتا۔

ایک بات ہم ارباب شریعت سے بھی پوچھنا چاہتے ہیں۔ قرآن میں ہے

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)

زمین میں کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ جب شہاب الدین کے بھائی بہن اور والدہ، اس کی تمام کوششوں کے باوجود، بھوکے مر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کی وہ ذمہ داری جس کا ذکر اس نے اس آیت میں کیا ہے، کہاں تھی؟ [یاد رکھئے کہ ہمارے پاس اس کا جواب ہے، لیکن ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جس اسلام کے علمبردار یہ ارباب مذہب ہیں، اس کی رُو سے اس کا جواب کیا ہے؟]

کیا کوئی صاحب ان سے اتنا پوچھ کر ہمیں بتائیں گے؟

"صالحین" کے کارنامے

اس دفعہ لاہور کے ہمارے ایک عزیز دوست نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ طلوع اسلام کو جماعت اسلامی کے خلاف اس تکرار و اصرار سے نہیں لکھنا چاہیئے اس سے کچھ اچھا اثر پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے دل میں اس عزیز دوست کی بڑی قدر ہے لیکن ہم ان سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ

(۱) جب مودودی صاحب نے، پاکستان کی بھرپور مخالفت کے بعد، اپنا کاروبار لاہور میں منتقل کیا تھا، تو آپ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ شخص "خارجی" ہے اور اس کے ہاتھوں نہ پاکستان محفوظ رہ سکتا ہے نہ اسلام۔ چنانچہ مودودی صاحب کی بعد کی حرکات نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ اندازہ کس قدر صحیح تھا۔

(۲) اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یا جماعت، پاکستان اور اسلام دشمنی میں برابر مصروف رہے، تو کیا آپ کا یہ مشورہ ہے کہ اسے ..... ایک آدھ مرتبہ ٹوک دینا تو ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد اسے کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ اس وقت اس جماعت کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے تنخواہ دار مبلغین کے علاوہ) بیسیوں اخبارات ہیں جو اپنے "نادیانہ" پروپیگنڈے میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف عوام کو اپنے ساتھ ملائے رکھا جائے اور دوسری طرف ارباب حل و عقد کو اپنی طاقت سے مرعوب کیا جائے۔ ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اگر اس جماعت کی قوت اسی طرح بڑھتی گئی تو جو کچھ مصر میں اخوان المسلمین، ایران میں فدائیان اسلام، اور انڈونیشیا میں دارالاسلام والوں نے کیا ہے اور کر رہے ہیں، وہی کچھ پاکستان میں ہوگا۔ ان لوگوں کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کا ابھی سے یہ عالم ہے کہ مودودی صاحب نے پچھلے دنوں اپنی کراچی اور لاہور کی تقریروں میں کھلے بندوں امریکہ سے کہا کہ تم جو حکومت پاکستان سے "ساز باز" کر رہے ہو، یہ تمہاری بہت بڑی غلطی ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ کل کو جنگ کی صورت میں پاکستان تمہارا مددگار و معاون ہو تو تمہیں پاکستان کے نمائندوں کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیئے۔ (تفصیل اس کی ہفتہ وار طلوع اسلام کی ایک اشاعت میں دی جا چکی ہے۔) اس کے ساتھ، یہ جماعت اندر ہی اندر جو کچھ کر رہی ہے اس کا اندازہ، مغربی پاکستان کے وزیر اعظم، ڈاکٹر خان صاحب کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس کے سامنے دیا۔ جب ان سے کہا گیا کہ پولیس جماعت اسلامی کے دفاتر پر چھاپے مار کر ان کے بہت سے کاغذات لیگئی ہے، تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ

> جماعت اسلامی اچھے کام نہیں کر رہی۔ دوسرے ممالک میں ایسی تخریبی کارروائیوں کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ جو لوگ بیرونی ممالک کے سامنے پاکستان کی بھیانک تصویر پیش کریں، انہیں کبھی وفادار شہری نہیں کہا جا سکتا۔ ایسی کارروائیاں کرنے والے کبھی پاکستان کے مخلص بہی خواہ نہیں سمجھے جا سکتے۔ (اس کے بعد انہوں نے کہا کہ) حال ہی میں حکومت مغربی پاکستان

> ڈاک خانہ کے سنسر کے دوران میں قابلِ اعتراض مطبوعہ لٹریچر ہاتھ آیا جو مشرق وسطیٰ کی بعض سیاسی جماعتوں کے نام بھیجا جا رہا تھا۔ جماعت اسلامی کے دفاتر پر چھاپے اسی بنا پر مارے گئے ہیں۔
>
> ڈان — پ ۱۲،

کہئے کہ جو جماعت اس قسم کی حرکتیں کر رہی ہو، اس کے خلاف کچھ نہ کہا جائے؟ یہ سب کچھ دیکھا جائے اور زبان بند کر کے بیٹھ رہا جائے؟ معاف رکھئے! طلوع اسلام سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ تحریک پاکستان کے دوران میں جب طلوع اسلام نیشنلسٹ علماء (بالخصوص ابوالکلام صاحب آزاد، اور حسین احمد صاحب مدنی) کے خلاف اسی طرح مسلسل و متواتر لکھتا تھا، تو بعض دوستوں کی طرف سے اس قسم کے مشورے ملتے تھے۔ اس نے کسی کی نہ سنی اور اپنی دھن میں مصروف رہا۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ اب بھی وہ ہر اس شخص یا ادارہ اور جماعت کی مخالفت، جو پاکستان اور اسلام کے خلاف تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہو، اپنا بنیادی فریضہ سمجھتا ہے جس کی ادائیگی میں وہ ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اسے یقین ہے کہ اس کی بے سروسامانی کے باوجود اس کی یہ کوششیں آخر الامر بار آور ہو کر رہیں گی۔ اور اگر یہ محسوس طور پر بار آور نہ بھی ہوئیں تو اسے اس کا تو اطمینان ہو گا کہ اس نے باطل کی تردید میں امکان بھر کوشش کر دی۔

۲ - وزیر اعظم سے تعلقات

ایک طرف تو یہ جماعت بیرونی ممالک سے پاکستان کے خلاف یہ ساز باز کر رہی ہے اور دوسری طرف اہل پاکستان کو اس کا یقین دلا رہی ہے کہ پاکستان کے وزیر اعظم (چوہدری محمد علی صاحب) سے ہمارے تعلقات نہایت گہرے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ان کے متفقین (یہ سمجھ کر کہ شاید حکومت ان کے خلاف ہے) ان سے بدک نہ جائیں۔ اور جو افسران ماتحت ان پر ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں، وہ (یہ سمجھ کر کہ ان کے تو وزیر اعظم کے ساتھ ایسے گہرے تعلقات ہیں) ان سے مرعوب ہو جائیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پچھلے دنوں، اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ گذشتہ اکتوبر میں مودودی صاحب نے محترم وزیر اعظم صاحب سے رات کے وقت ملاقات کی جس کا ذکر، باہر نہیں آیا۔ اس وقت تو مودودی صاحب بالکل خاموش رہے۔ اب جبکہ حکومت مغربی پاکستان کے دفاتر میں اپنے خلاف کچھ ہلچل محسوس کی تو، ایک مستفسر کے خط کے جواب میں، حسب ذیل خط اخبارات میں شائع کرا دیا۔

لاہور ۲۷ دسمبر ۱۹۵۵ء

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ چودھری محمد علی صاحب سے میرے ذاتی تعلقات پندرہ سولہ برس پرانے ہیں اور برادرانہ حد تک ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی وہ میرے ہاں تشریف لاتے تھے اور میں ان کے ہاں جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ہمیشہ مجھ سے ملتے رہے۔ ان کی سرکاری پوزیشن اور میری سیاسی پوزیشن کبھی ان تعلقات میں مانع نہیں ہوئی۔ اب اُن کے وزیر اعظم بن جانے کے بعد آخر یہ ذاتی دوستی کیوں ختم ہو جائے۔

بعض لوگوں نے از راہ شرارت میری اور ان کی ملاقات کو "خفیہ ملاقات" قرار دیا ہے اور اکتوبر کی ایک ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا میرے اور ان کے درمیان کوئی ساز باز ہوا تھا۔ حالانکہ میں جب کبھی کراچی جاتا ہوں اُن سے ایک دو

ملاقاتیں ضرور ہوتی ہیں۔ اور چونکہ رات ہی کا وقت میری اور ان کی فرصت کا ہو سکتا ہے اس لئے رات ہی کو ملتے ہوتی ہیں۔ اس قسم کی ملاقاتوں میں میل جول کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کا ذکر اخبارات میں آئے۔ البتہ جس روز امیر جماعت اسلامی اور وزیر اعظم پاکستان کی کوئی بات چیت سیاسی گفت و شنید کی نوعیت کی ہوگی، تو انشاء اللہ وہ منظر عام پر ہوگی۔

افسوس ہے کہ سیاست بازوں کو ہر چیز میں سیاست بازی اور گٹھ جوڑ ہی نظر آتا ہے مگر میں ان کا ہم جنس نہیں ہوں، نہ کسی کے طعن و تشنیع سے اپنی وضع میں تغیر کر سکتا ہوں۔

خاکسار
ابوالاعلیٰ
(تسنیم ۱۶ ؍ ۶)

مودودی صاحب سے محترم چوہدری محمد علی صاحب کے تعلقات کس قسم کے ہیں، اس کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر تو چوہدری صاحب ہی بتا سکتے ہیں، لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، اس باب میں دو ایک باتیں بدیہی طور پر غلط نظر آتی ہیں۔ مودودی صاحب نے کہا ہے کہ ان کے چوہدری صاحب سے "ذاتی تعلقات" اور "ذاتی دوستی" ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ذاتی تعلقات یا تو رشتہ داروں میں ہوتے ہیں۔ یا ایسے لوگوں میں جو (مثلاً) ایک ہی محلہ کے رہنے والے ہوں۔ ایک ہی اسکول یا کالج میں ہم درس رہے ہوں۔ سروس میں اکٹھے رہے ہوں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی یہ تعلقات اکٹھے مل جل کر رہنے سہنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ان میں خیالات کے توافق کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس قسم کے تعلقات خیالات کے اختلاف کے باوجود قائم رہتے ہیں۔ دوسری قسم کے تعلقات وہ ہوتے ہیں جو خیالات و نظریات کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ صرف اس وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک خیالات و نظریات میں توافق باقی رہے۔ مودودی صاحب اور چوہدری صاحب میں پہلی قسم کا اشتراک زندگی کبھی نہیں رہا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ان کی پہلی مرتبہ ملاقات اس وقت ہوئی جب مودودی صاحب دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں جماعت اسلامی کی طرح ڈال کر جماعت ہی کی تبلیغ کے سلسلہ میں دہلی آتے تھے۔ اس زمانے میں چوہدری صاحب مودودی صاحب کے خیالات سے متاثر تھے اور یہی چیز ان کی ملاقات اور تعلقات کا باعث بنی تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں (جب مودودی صاحب چوہدری صاحب کے ہاں قیام کرتے تو) وہاں چوہدری صاحب کے احباب کے اجتماعات بھی ہوتے اور ان میں مودودی صاحب کے خیالات اور تحریک کے متعلق گفتگو ہوتی۔ ہم ارباب فکر و ہوش سے یہ پوچھتے ہیں کہ جن تعلقات کی بنیاد کسی کے خیالات یا تحریک سے ہم آہنگی کی بناء پر ہو، کیا ان تعلقات کو "ذاتی تعلقات" کہا کرتے ہیں؟

یہ تو ہے پاکستان بننے سے پہلے کا تعلق۔ مودودی صاحب کا بیان ہے کہ "پاکستان بننے کے بعد بھی وہ ہمیشہ مجھ سے ملتے رہے" ہم اس بیان کو صحیح تسلیم کرنے میں متامل ہیں۔ اس لئے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک طرف تو چوہدری محمد علی صاحب حکومت پاکستان کے سکریٹری جنرل اور وزیر فنانس تھے اور دوسری طرف آپ اس شخص سے بھی ملتے رہتے تھے (اور ان ملاقاتوں کا ذکر کبھی باہر نہیں آتا تھا) جسے خود ان کی حکومت نے کشمیر جیسے نازک مسئلہ میں غداری کے جرم میں قید کر دیا تھا۔ پھر اسے ملک میں فساد برپا کرنے کے جرم میں پہلے سزائے موت دی تھی۔ پھر عمر قید کی سزا۔ جس شخص کی جماعت کو حکومت نے سیاسی پارٹی قرار دیا تھا۔ جس کا لٹریچر اور روپیہ حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ جسے اب بھی مغربی پاکستان کا وزیر اعظم غدار وطن قرار دے رہا ہے؟ کیا ہم یہ

باور کرلیں کہ جو شخص مسلسل آٹھ برس سے یہ کچھ کر رہا ہے اور حکومت اس کے خلاف اس قسم کے اقدامات کرتی رہی اور کر رہی ہے، اس حکومت کے سکریٹری جنرل، وزیر اعظم، وزیر اعظم اس کے ساتھ برادرانہ تعلقات رکھتا ہے۔ ہم چوہدری صاحب جیسے پاکستان دوست انسان کے متعلق ایسا باور کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر چوہدری صاحب کبھی بھی یہ سمجھتے کہ مودودی صاحب ان جرائم کے مرتکب نہیں ہوئے جن کی بنا پر حکومت ان کے خلاف یہ کچھ کرتی رہی ہے، اور حکومت ان کے خلاف دھاندلی کر رہی ہے تو وہ ایسی مستبد اور نا انصاف حکومت سے فوراً الگ ہو جاتے۔ چونکہ انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لئے اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کو حق بجانب اور مودودی صاحب کو ان سنگین جرائم کا مرتکب سمجھتے تھے۔ اس کے بعد یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ جس شخص کو چوہدری صاحب ایسا سمجھیں اس سے اپنے تعلقات بھی وابستہ رکھیں۔ ہم محترم چوہدری صاحب سے باادب گذارش کریں گے کہ وہ اس باب میں اصل حقیقت کی وضاحت فرمادیں کیونکہ مودودی صاحب کا خط ان کے متعلق ملک میں بڑی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب بن رہا ہے۔

۳- اتہام تراشیاں

اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ یہ "صالحین" اپنے مخالفین کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے میں کس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ گذشتہ دسمبر میں حیدرآباد (سابقہ سندھ) کے روزنامہ عبرت کے مدیر محمد عثمان ڈیپلائی صاحب کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ

> کافی عرصہ پہلے مجھے چوہدری غلام محمد قیم جماعت اسلامی، صوبہ سندھ نے کہا تھا کہ جناب پرویز کو مرکز نے ایک لاکھ کی امداد دینی منظور کی ہے، جس میں سے بیس ہزار ملی ہے اور باقی ملنی ہے۔ اس کے بعد سنا کہ چوہدری محمد علی نے برسرِ اقتدار آتے ہی وہ بقیہ بند کردی لہٰذا آپ ہر آنے قیمت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اب سنا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ہفتہ وار بند کرکے پھر ماہانہ پرچہ کیا جا رہا ہے۔ یہ افواہیں جماعت اسلامی کے حلقوں میں سے سنی جاتی ہیں۔

اس پر ہم نے، چوہدری غلام محمد صاحب کی خدمت میں حسب ذیل خط، مورخہ ۲۸/۱۲ ۵۹ء کو بصیغہ رجسٹری بھیجا۔

حیدرآباد سندھ کے روزنامہ "عبرت" کے مدیر محمد عثمان ڈیپلائی صاحب نے اپنے ایک خط میں حسب ذیل سطور تحریر فرمائی ہیں۔

> "کافی عرصہ پہلے مجھے چوہدری غلام محمد قیم جماعت اسلامی صوبہ سندھ نے کہا تھا کہ جناب پرویز کو مرکز نے ایک لاکھ کی امداد دینی منظور کی ہے۔ جس میں سے بیس ہزار ملی ہے باقی ملنی ہے۔
>
> اس کے بعد سنا کہ چوہدری محمد علی نے برسرِ اقتدار آتے ہی وہ بقیہ بند کردی لہٰذا آپ ہر آنے قیمت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اب سنا ہے کہ یہی وجہ ہے ہفتہ وار بند کرکے پھر ماہانہ پرچہ کیا جاتا ہے۔
>
> یہ افواہیں جماعت اسلامی کے حلقوں میں سے سنی جاتی ہیں۔

کیونکہ یہ بات بڑی اہم ہے اور قرآن کا حکم ہے کہ ان قسم کی باتوں کی تصدیق کرنا ضروری ہے اس لئے افواہوں سے قطع نظر مندرجہ بالا بیان میں جو

بات خاص طور پر آپ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ ہم شکر گذار ہوں گے اگر آپ ہمیں مطلع فرمائیں کہ کیا آپ نے واقعی وہ بات ان صاحب سے کہی تھی ؟ اگر کہی تھی تو آپ کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے ؟

معاملہ کی اہمیت کے پیش نظر یہ خط بصیغۂ رجسٹری بھیجا جا رہا ہے اور جواب کے لئے ساڑھے پانچ آنے کے ٹکٹ ارسال ہیں تاکہ آپ بھی جواب بصیغۂ رجسٹری بھیج سکیں۔ والسلام۔

یہ خط ۱۰ر دسمبر کو رجسٹری کرکے بھیجا گیا تھا۔ آج (۳۰ر جنوری) تک اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ یہ لوگ کس قماش کے واقع ہوئے ہیں اور ملک میں کیا کچھ کر رہے ہیں۔

نغانِ من دلِ خلق آب کرد، ور نہ ہنوز
جمعنتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد !

اور انہی کے متعلق ہم سے کہا جا رہا ہے کہ انہیں کچھ نہ کہو۔ انہیں اپنی من مانی کرنے دو۔

انہیں اپنی من مانی کرنے دو اور پھر دیکھو کہ اس ملک میں
کوئی شریف آدمی بھی عافیت سے رہ سکتا ہے ؟

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

مزاج شناس رسول
یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی ؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہیں؟ اسکی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۳۴۸ صفحات قیمت چار روپے

مقام حدیث
حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات۔ اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوس گم گشتہ (از پرویز)
ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف۔ ۴۱۲ صفحات۔ قیمت فی جلد چار روپے

نوادرات از علامہ اسلم جیراج پوریؒ
علامہ موصوف رح کے مضامین کا نادر مجموعہ
چار سو صفحات قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از پرویز
مسلمان کے عادات واخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض وواجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔
صفحات ایک سو بانوے ۱۹۲ قیمت دو روپے

نظام ربوبیت از پرویز
انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب ضخامت تین سو صفحے۔ قیمت قسم اول۔ چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

اقبال اور قرآن از پرویز
علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ۔ ڈسٹ کور کے ساتھ
(صفحات دو سو چھپن) قیمت دو روپے

تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ (محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا۔

ملنے کا پتہ:- **ادارۂ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۱۳۔ کراچی**

"لمعات"

(صفحہ ۱۰ سے آگے)

اس کے لئے ہماری تجویز یہ ہے کہ موجودہ "جمہوری تماشا" کو ختم کرکے (جس کی رخصت خواہ مخواہ بیس تیس تقریریں ضروری سمجھی جاتی ہیں حالانکہ ہر ایک کو معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ہونا وہی ہے جو اکثریت چاہے گی۔ اور اکثریت جو کچھ چاہے گی اس کا علم پہلے سے ہوتا ہے) اس بل کو کثرت آراء سے پاس کر لیا جائے تاکہ موجودہ تعطل، بے حسی، جمود اور افسردگی ختم ہو جائے۔

لیکن اگر فیصلہ یہی ہے کہ بل پر حسب معمول بحث و تمحیص بھی ہوگی اور اس میں مزید ترمیمات بھی اسی وقت کی جائیں گی تو ارکان اسمبلی سے ہماری گذارش یہ ہے کہ قرآنک ریسرچ سنٹر (مرکز تحقیقات قرآنیہ) کراچی کی طرف سے ان کی خدمت میں جو پانچ چھ چٹھیاں بھیجی گئی ہیں، آپ ان پر سنجیدگی سے غور فرمائیں۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں کہ ان میں جو کچھ کہا گیا ہے صحیح اسلامی آئین کی بنیاد انہی خطوط پر استوار کی جا سکتی ہے، تو آپ ہمت اور جرأت سے کام لیں اور ان کے مطابق مسودہ میں ضروری ترمیمات کر لیں۔ آپ ایک اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے جمع ہوئے ہیں جس کے لئے آپ کو نہ صرف موجودہ اور آنے والی نسلوں کے سامنے بھی جوابدہ ہونا پڑے گا بلکہ خدا کے حضور بھی اس کا جواب دینا ہوگا کہ ہم نے اس امانت کی کس حد تک حفاظت کی تھی اور اس کے عطا کردہ خطۂ زمین پر اس کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق عمارت تعمیر کرنے میں کیا کوشش کی تھی۔ ہمیں اس باب میں جو قرآنی بصیرت عطا ہوئی ہے، ہم نے اسے مختلف انداز سے آپ تک پہنچا دیا ہے تاکہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں آپ ممد و معاون بنے اس کے بعد ذمہ داری آپ کی ہے۔

واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔

شاہی

عام کمزوری، ضعف اعصاب کو دور کرتی، معدہ اور جگر کی اصلاح کرکے ہاضمہ کو قوی کرتی اور جسم میں بکثرت خون صالح پیدا کرتی ہے۔

ہر اسٹور سے مل سکتی ہے

طبیہ دواخانہ ــ نیپیئر روڈ ــ کراچی ۲